الرسالہ

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

ISSN 0970-180X

اختلافی مسئلہ کا حل اکثر حالات میں یہ ہوتا ہے کہ
آپ اپنے مسئلہ کو فریق ثانی کا مسئلہ بنا دیں

شمارہ ۱۶۶ ستمبر ۱۹۹۰

تذکیر القرآن

جلد اوّل : سورۃ فاتحہ۔ سورۃ بنی اسرائیل
جلد دوم : سورۃ الکہف ۔ سورۃ الناس

قرآن کی بے شمار تفسیریں ہر زبان میں لکھی گئی ہیں۔ مگر تذکیر القرآن اپنی نوعیت کی پہلی تفسیر ہے۔ تذکیر القرآن میں قرآن کے اساسی مضمون اور اس کے بنیادی مقصد کو مرکزِ توجہ بنایا گیا ہے۔ جزئی مسائل اور معلوماتی تفصیلات کو چھوڑتے ہوئے اس میں قرآن کے اصل پیغام کو کھولا گیا ہے اور عصری اسلوب میں اس کے دعوتی اور تذکیری پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ تذکیر القرآن عوام و خواص دونوں کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔ وہ طالبینِ قرآن کے لیے فہمِ قرآن کی کنجی ہے۔

مکتبہ الرسالہ، نئی دہلی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۶۶ ستمبر ۱۹۹۰

فہرست

ماہانہ الرسالہ، سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳ فون: 697333, 611128

آخرت کی نعمتیں

محمد شفیع قریشی کشمیری (پیدائش ۱۹۲۹) نے اپنی ابتدائی تعلیم سری نگر میں حاصل کی اور اس کے بعد علی گڑھ سے بی اے، ایل ایل بی کیا۔ انھوں نے اپنے بچپن کا ایک واقعہ بتاتے ہوئے کہا: میں نے ابتدائی تعلیم چرچ مشن اسکول (سرینگر) میں پائی۔ اس وقت اس کے پرنسپل ایک انگریز مسٹر بسکو تھے۔ ان کو کشمیر میں تعلیم کا پیش رو کہا جاتا ہے۔ وہ سب سے پہلے کشمیر میں سائیکل لے آئے۔ کشمیر کے کسٹم والوں نے اب تک سائیکل نہیں دیکھی تھی۔ جب وہ آئی تو کسٹم والوں کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ کیا چیز ہے اور اس کو اپنے کاغذات میں کس نام سے درج کیا جائے۔ بہت غور و خوض کے بعد انھوں نے مسٹر بسکو کی سائیکل کو "فولادی گھوڑا" لکھا۔ جلد ہی پورے شہر میں یہ خبر پھیل گئی کہ مسٹر بسکو ولایت سے کوئی فولادی گھوڑا لائے ہیں (شبستان مئی ۱۹۷۲)

جن لوگوں نے "فولادی گھوڑا" کو اپنی آنکھ سے نہیں دیکھا تھا، صرف اس کی خبر سنی تھی، وہ عرصہ تک یہی سمجھتے رہے کہ وہ گھوڑے کی طرح کا کوئی جانور ہے جو ہڈی اور گوشت کے بجائے لوہے کا بنا ہوا ہے۔

پچاس سال بعد دنیا اب "بائیسکل" کے دور سے گزر کر "ہوائی جہاز" کے دور میں داخل ہو گئی ہے۔ آج ایک شخص ہوائی جہاز پر تیز رفتاری کے ساتھ اڑ رہا ہو۔ اس وقت وہ نیچے دیکھے اور کسی سڑک پر اس کو نظر آئے کہ ایک آدمی بائیسکل چلاتا ہوا گزر رہا ہے تو اس کو اپنے درمیان اور بائیسکل سوار کے درمیان بہت زیادہ فرق دکھائی دے گا۔

یہی فرق زیادہ بڑے پیمانہ پر آخرت میں ظاہر ہونے والا ہے۔ آخرت کی سواریاں اتنی اعلیٰ اور اتنی کامل ہوں گی کہ جو لوگ ان سواریوں پر سفر کریں گے وہ موجودہ ہوائی جہاز کو اس سے بھی عجیب نظر سے دیکھیں گے جتنا کہ آج ہوائی جہاز کا مسافر کسی بائیسکل سوار کو دیکھتا ہے۔

دنیا کی ہر چیز ناقص ہے، آخرت کی ہر چیز کامل ہوگی۔ دنیا کی ہر چیز محدود ہے، آخرت کی ہر چیز لامحدود ہوگی۔ دنیا کی ہر چیز غیر معیاری (imperfect) ہے، آخرت کی ہر چیز معیاری (perfect) ہوگی۔

کتنا خوش نصیب ہے وہ انسان جس کو آخرت کی نعمتیں دیدی جائیں۔ اور کتنا بد نصیب ہے وہ انسان جو آخرت کی نعمتوں میں حصہ پانے سے محروم رہے۔

اخلاقی زہر

۶ جنوری ۱۹۹۰ کو دہلی (شکرپور) میں ایک دردناک واقعہ ہوا۔ کچھ چھوٹے بچے ایک میدان میں کھیل رہے تھے۔ وہاں ایک طرف کوڑے کا ڈھیر تھا۔ وہ کھیلتے ہوئے اس کوڑے تک پہونچ گیے۔ یہاں انھیں ایک پڑی ہوئی چیز ملی۔ یہ کوئی زہریلی چیز تھی۔ مگر انھوں نے بے خبری میں اس کو اٹھا کر کھالیا۔ اس کے نتیجہ میں دو بچے فوراً ہی مر گیے، اور آٹھ بچوں کو تشویشناک حالت میں جے پرکاش نرائن اسپتال میں داخل کرنا پڑا۔ یہ بچے دو سال سے پانچ سال تک کے تھے۔

ٹائمس آف انڈیا (۷ جنوری ۱۹۹۰) نے صفحۂ اول پر اس کی خبر دیتے ہوئے لکھا ہے کہ ان بچوں میں سے ایک نے وہاں ایک چھوٹا پیکٹ پایا۔ اس میں تقریباً ڈیڑھ سو گرام کوئی سفید رنگ کا سفوف تھا۔ انھوں نے غلطی سے اس کو شکر سمجھا اور آپس میں تقسیم کرکے کھانے لگے۔ کھانے کے چند منٹ بعد ان کے ہونٹ نیلے پڑ گیے:

> One of them found a small packet containing about 150 gm of white, powdery substance. They mistook it for sugar and distributed it among themselves. Within minuters of consuming it, their lips turned blue.

مادی خوراک کے اعتبار سے یہ چند بچوں کا واقعہ ہے۔ لیکن اخلاقی خوراک کے اعتبار سے دیکھئے تو آج یہی تمام انسانوں کا واقعہ ہے۔ آج کی دنیا میں تمام انسان ایسی اخلاقی غذائیں کھا رہے ہیں جو ان کی انسانیت کے لیے زہر ہیں، جو ان کو ابدی ہلاکت سے دوچار کرنے والی ہیں۔

جھوٹ، بدکاری، رشوت، غرور، حسد، الزام تراشی، ظلم، غصب، بددیانتی، وعدہ خلافی، بدخواہی، بے اصولی، بدمعاملگی، انانیت، بے اعترافی، غلطی نہ ماننا، احسان فراموشی، خود غرضی، انتقام، اشتعال انگیزی اپنے لیے ایک چیز پسند کرنا اور دوسرے کے لیے کچھ اور پسند کرنا، یہ تمام چیزیں اخلاقی معنوں میں زہریلی غذائیں ہیں۔ آج تمام لوگ ان چیزوں کو میٹھی شکر سمجھ کر کھا رہے ہیں۔ مگر وہ وقت زیادہ دور نہیں جب ان کا زہریلا پن ظاہر ہوگا۔ اور پھر انسان اپنے آپ کو اس حال میں پائے گا کہ وہاں نہ کوئی اس کی فریاد سننے والا ہوگا اور نہ کوئی اس کا علاج کرنے والا۔

نظریہ کی فوقیت

امریکہ کے ایک ادارہ نے اپنے جائزہ (ٹائمس آف انڈیا اکتوبر ۱۹۸۹) میں پایا ہے کہ ان کے سوال نامہ کا جواب دینے والے امریکیوں میں ۶۳ فی صد ایسے لوگ تھے جن کا خیال تھا کہ امریکہ کی خارجہ پالیسی کے لیے سب سے بڑا چیلنج اب سوویت یونین کا فوجی خطرہ نہیں ہے بلکہ سب سے بڑا چیلنج وہ اقتصادی خطرہ ہے جو جاپان جیسے ملکوں کی طرف سے پیش آرہا ہے :

A recent survey by the American Insight Group of Cambridge (Mass) found that 63 per cent of their respondents felt that the biggest foreign policy challenge is no longer a military threat from the Soviet Union, an economic threat from countries like Japan.

مگر دولت اور طاقت کا اتنا بڑا ذخیرہ جمع کر لینے کے باوجود جاپان عالمی سطح پر وہ اہمیت حاصل نہ کر سکا جو بظاہر اسے حاصل کرنا چاہیے۔ اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جاپان کے پاس اقتصادی طاقت ہے مگر جاپان کے پاس نظریہ نہیں۔ یہی بات ہے جو امریکی بینکر مسٹر مرفی (W. Taggart Murphey) نے اس طرح کہی کہ جاپان ایک ایسی سوسائٹی ہے جس کی حیثیت طاقت بغیر مقصد (Power without purpose) کی ہے۔ جاپان کے پاس دنیا کو دینے کے لیے کوئی چیز نہیں، سوا اپنے بارہ میں انوکھے پن کے ایک تصور کے :

Japan has nothign to offer the world — only the idea of its uniqueness.

سیاسی طاقت یا فوجی طاقت بظاہر بہت بڑی چیز معلوم ہوتی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ نظریہ کی طاقت اس سے بھی زیادہ بڑی ہے۔ مادی طاقت نظریہ کے بغیر بے حقیقت ہے۔ جب کہ نظریہ کا معاملہ یہ ہے کہ وہ مادی طاقت کے بغیر بھی ناقابل تسخیر طاقت کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس گروہ کے پاس ایک نظریہ ہو۔ جو انسانوں کو ایک اعلیٰ مقصد کا تصور دے سکتا ہو۔ وہ سب سے بڑی چیز کا مالک ہے۔ وہ خود اپنی بنیاد پر کھڑا ہو سکتا ہے، وہ ہر چیلنج کا مقابلہ کر کے آگے بڑھ سکتا ہے۔ نظریہ دوسری چیزوں پر قیادت کرتا ہے، دوسری چیزیں نظریہ کے اوپر قائد نہیں بن سکتیں۔

عمل کا رُخ

لندن کی لجنۃ الاقلیات الاسلامیہ نے بتایا ہے کہ مختلف ملکوں میں جو مسلم اقلیتیں آباد ہیں، ان کی مجموعی تعداد ۴۰۰ ملین ہے۔ اس طرح ساری دنیا کی کل مسلم آبادی کا ۴۰ فی صد حصہ مسلم اقلیتوں پر مشتمل ہے (صفحہ ۲)

جامعہ ازہر قاہرہ میں ایک اسلامی کانفرنس ہوئی۔ اس موقع پر تقریر کرنے والوں میں دکتور عبدالصبور مرزوق بھی تھے۔ انھوں نے اپنی تقریر میں بتایا کہ مسلم اقلیت کے ملکوں کے مسلمان اپنے ملک کے اکثریتی فرقہ کی جارحیت کا شکار ہو رہے ہیں۔ حتی کہ ان کے ہاتھوں موت سے دوچار ہونے والے مسلمانوں کی تعداد ۳۰ ملین تک پہونچ چکی ہے۔ انھوں نے مسلم ملکوں کے وزرار خارجہ سے اپیل کی کہ وہ مسلم اقلیتوں کے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کریں (صفحہ ۱) اخبار العالم الاسلامی، ۲۸ رجب ۱۴۰۹ھ، ۶ مارچ ۱۹۸۹

یہ کسی ایک شخص کی بات نہیں۔ موجودہ زمانہ کے تمام مسلم رہنما ایک یا دوسری شکل میں اسی بات کو دہرا رہے ہیں۔ مگر اس معاملہ میں ہمارے رہنما اب تک جو کچھ کرتے رہے ہیں وہ صرف ایک ہے ــــ اکثریتی فرقہ یا غیر مسلم حکومت کے خلاف فریاد اور احتجاج کرنا۔ مگر یہ معاملہ اس سے زیادہ سنگین ہے۔ یہ ہم کو غیر مسلم طاقت کے خلاف احتجاج سے زیادہ رجوع الی اللہ کی دعوت دیتا ہے۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ ایک چھوٹی جماعت بھی بڑی جماعت پر غالب آجاتی ہے، اللہ کے اذن سے، اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے (کم من فئۃ قلیلۃ غلبت فئۃ کثیرۃ باذن اللہ واللہ مع الصابرین، البقرہ ۲۴۹) یہ آیت بتاتی ہے کہ مسلمانوں کے کسی گروہ کو اگر اپنے ماحول میں غلبہ حاصل نہ ہو تو انھیں یہ سمجھنا چاہیے کہ وہ اذن اللہ سے محروم ہو گیے ہیں۔ ایسی حالت میں انھیں ففروا الی اللہ (الذاریات ۵۰) کے حکم خداوندی پر عمل کرنا چاہیے۔ انھیں اللہ کی طرف دوڑنا چاہیے، نہ کہ وہ غیر مسلم جماعتوں یا غیر مسلم حکمرانوں کے خلاف احتجاج میں مشغول ہو کر بے فائدہ طور پر اپنا وقت اور اپنی طاقت ضائع کریں۔

اخلاق کا پھل

بدرالدین احمد (پیدائش ۱۹۳۸) مراد آباد کے رہنے والے ہیں۔ انھوں نے مراد آباد کے فرقہ وارانہ فساد کے بارہ میں کئی سبق آموز واقعات بتائے۔ یہ فساد ۱۳ اگست ۱۹۸۰ کو شروع ہوا تھا اور رک رک کر اگلے مہینہ تک جاری رہا۔

فساد کے دوران کرفیو لگا ہوا تھا۔ ہر طرف ابتر حالات تھے۔ لوگوں کے گھروں میں کھانے پینے کی چیزیں ختم ہوگئی تھیں۔ بدرالدین صاحب نے بتایا کہ اس زمانہ میں ہم لوگوں کو دودھ نہیں ملتا تھا۔ اس لیے ہم لوگ بغیر دودھ کی چائے گرم پانی کر کے پی لیا کرتے تھے۔

پولیس کے ایک افسر مسٹر شرما نے ایک دکان سے پیتل کے کچھ کھلونے (شو پیس) خریدے۔ اس کو ان کھلونوں پر پالش کروانا تھا۔ وہ پالش کے لیے بدرالدین احمد صاحب کے یہاں آیا۔ انھوں نے کھلونوں پر پالش کر دی۔ مگر اس کا کوئی پیسہ نہیں لیا۔

اس اخلاق کا نتیجہ یہ ہوا کہ پولیس افسر جب روزانہ راؤنڈ پر نکلتا تو بدرالدین صاحب کے یہاں اپنی گاڑی روک کر اترتا اور حال پوچھتا کہ کوئی پریشانی تو نہیں ہے۔ ہماری کوئی ضرورت ہو تو بتائیے۔ اس طرح وہ روزانہ کم از کم ایک بار آتا رہا۔

ایک روز مسٹر شرما آئے تو بدرالدین صاحب اپنے چھوٹے بچے (نجم الدین احمد) کو گود میں لیے ہوئے تھے۔ مسٹر شرما نے پوچھا کہ یہ بچہ تو دودھ پیتا ہوگا۔ بدرالدین صاحب نے کہا کہ ہاں۔ مسٹر شرما نے کہا کہ پھر آپ کو دودھ ملنے میں تو کوئی پریشانی نہیں۔ بدرالدین صاحب نے کہا کہ پریشانی تو ہے، اس لیے کہ کرفیو لگا ہوا ہے۔ اس کے بعد مسٹر شرما چلے گئے۔ اگلے دن آئے تو ان کے ساتھ گلیکسو ملک کا دو ڈبہ بھی تھا۔ انھوں نے یہ دونوں ڈبہ بدرالدین صاحب کو دیتے ہوئے کہا "یہ آپ کے بچہ کے لیے میری طرف سے تحفہ ہے"

اخلاق کے اندر اللہ تعالیٰ نے سب سے زیادہ تسخیری طاقت رکھی ہے۔ یہ طاقت اتنی زیادہ ہے کہ وہ بدنام پولیس کو بھی مسخر کر لیتی ہے۔ اخلاق ایک ایسا خاموش ہتھیار ہے جو ہر آدمی پر کارگر ثابت ہوتا ہے، حتی کہ کٹر دشمن کے اوپر بھی۔

رہے تھے۔ وہاں ایک طرف کوڑے کا ڈھیر

انھیں ایک پڑی ہوئی چیز ملی۔ یہ کوئی زہریلی چیز تھی۔

کے نتیجہ میں دو بچے فوراً ہی مرگیے، اور آٹھ بچوں کو تشویشناک

داخل کرنا پڑا۔ یہ بچے دو سال سے پانچ سال تک کے تھے۔

ٹائمس آف انڈیا (۷ جنوری ۱۹۹۰) نے صفحۂ اول پر اس کی خبر دیتے ہو

درمیان جو نفرت پیدا

میں سے ایک نے وہاں ایک چھوٹا پیکٹ پایا۔ اس میں تقریباً ڈیڑھ سو گرام کوئی سفید

س نماز ہوگی،

تھا۔ انھوں نے غلطی سے اس کو شکر سمجھا اور آپس میں تقسیم کرکے کھانے لگے۔ کھانے کے بعد ان کے ہونٹ نیلے پڑگیے :

One of them found a small packet containing about 150 gm of white, powdery substance. They mistook it for sugar and distributed it among themselves. Within minuters of consuming it, their lips ιurned blue.

مادی خوراک کے اعتبار سے یہ چند بچوں کا واقعہ ہے۔ لیکن اخلاقی خوراک کے اعتبار سے دیکھئے تو آج یہی تمام انسانوں کا واقعہ ہے۔ آج کی دنیا میں تمام انسان ایسی اخلاقی غذائیں کھارہے ہیں جو ان کی انسانیت کے لیے زہر ہیں، جو ان کو ابدی ہلاکت سے دوچار کرنے والی ہیں۔

جھوٹ، بدکاری، رشوت، غرور، حسد، الزام تراشی، ظلم، غصب، بددیانتی، وعدہ خلافی، بدخواہی، بے اصولی، بدمعاملگی، انانیت، بے اعترافی، غلطی نہ ماننا، احسان فراموشی، خود غرضی، انتقام، اشتعال انگیزی، اپنے لیے ایک چیز پسند کرنا اور دوسرے کے لیے کچھ اور پسند کرنا، یہ تمام چیزیں اخلاقی معنوں میں زہریلی غذائیں ہیں۔ آج تمام لوگ ان چیزوں کو میٹھی شکر سمجھ کر کھارہے ہیں۔ مگر وہ وقت زیادہ دور نہیں جب ان کا زہریلا پن ظاہر ہوگا۔ اور پھر انسان اپنے آپ کو اس حال میں پائے گا کہ وہاں نہ کوئی اس کی فریاد سننے والا ہوگا اور نہ کوئی اس کا علاج کرنے والا۔

صحیح تدبیر ہے جس کو اختیار کرنا عملی طور پر ممکن ہو۔ ناممکن تدبیر کو تدبیر نہیں کہا جاسکتا۔ اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے لیے آزمودہ تدبیر صرف ایک ہے اور وہی ہے جس کو رواداری سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یعنی اختلاف کو گوارا کرتے ہوئے متحدہ زندگی گزارنا۔

عبرت ناک

محمود عالم صاحب (سرینگر) نے اپنا ایک واقعہ شائع کیا ہے۔ اس کا خلاصہ انھیں کے لفظوں میں اخبار دعوت (۱۰ اپریل ۱۹۹۰) سے یہاں نقل کیا جاتا ہے:

"ہم چند احباب ایک ہوٹل میں بیٹھے محو گفتگو تھے۔ یہ ہوٹل ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کے لیے ایک کلب کا کام کرتا تھا۔ روزانہ شام کو اس کے ہال میں جمع ہو کر لوگ ایک کپ گرم چائے کے ساتھ عالمی سیاست سے لے کر ملکی مسائل پر گرما گرم بحث کر سکتے تھے۔ ہم میں سے ہر ایک وہاں اپنی خطابت کا جوہر دکھاتا تھا۔ جس طرح مداری کی ڈگڈگی پر مجمع لگ جاتا ہے، ہماری شیریں بیانی سے لوگوں کی بھیڑ جمع ہونے لگی۔ آج ہماری گفتگو کا موضوع عرب اور اسرائیل کے درمیان ہونے والی جنگ تھی۔ ہم جوش و جذبہ سے اپنی معلومات پیش کر رہے تھے۔ ہمارے ایک فاضل دوست نے اپنے اندیشوں کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اگر مسلمانوں کی حالت یہی رہی تو بیت المقدس کی بازیابی کا معاملہ تو دور رہا، عجب نہیں کہ خانہ کعبہ پر بھی غیروں کا قبضہ ہو جائے۔ ابھی ہمارے دوست نے جملہ پورا نہیں کیا تھا کہ ایک دیہاتی مسلمان بگڑ گیا۔ "قرآن پڑھا ہے آپ نے، معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے قرآن کو نہیں پڑھا" اس نے تیز و تند لہجہ میں کہا۔ ہم زیر لب مسکرانے لگے۔ حاضرین کو دیہاتی کی یہ مداخلت مضحکہ خیز معلوم ہوئی۔ لیکن دیہاتی کے اگلے جملہ نے ہمارے ہوش اڑا دیئے "آپ نے سورہ فیل پڑھی ہے۔ اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِأَصْحَابِ الْفِيلِ کو جانتے ہیں آپ" ہمارے سر جھک گیے اور ہماری زبانیں گونگی ہو گئیں۔ کتنی سیدھی اور سچی بات تھی۔ ہم خاموشی سے اٹھ گیے۔ اور ہمیں احساس ہوا کہ ہم نے اب تک کچھ نہیں پڑھا۔ پڑھ لکھ کر بھی ہم جاہل رہ گیے"

موجودہ زمانہ کی مسلم تحریکوں کا یہ نہایت صحیح نقشہ ہے۔ جن چیزوں کی ذمہ داری خدا نے لے رکھی ہے، ان کے نام پر وہ ہنگامہ کرنے میں مصروف ہیں، اور جس چیز کی ذمہ داری خود ان پر ڈالی گئی ہے، اس کے لیے یہ تحریکیں کچھ نہیں کرتیں۔

"اسلام اور شعائر اسلام پر حملہ" جیسے موضوعات پر ہر آدمی جوش دکھا رہا ہے، حالاں کہ ان کے تحفظ کا ضامن خود خدا ہے۔ اور اسلام کی دعوت کے میدان میں کوئی سرگرم نہیں ہوتا، جب کہ مسلمانوں کا اصل کام یہی ہے اور اسی کے لیے وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں جواب دہ ہوں گے۔

پندرہ منٹ میں

ٹائمس آف انڈیا (۲ اپریل ۱۹۹۰) میں اوپی نین (opinion) کے کالم میں مسٹر رتن کیسوانی کی تحریر چھپی ہے۔ وہ اوبرائے ہوٹل (نئی دہلی) میں رومس ڈویژن منیجر ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ ایک خاتون سیاح ان کے ہوٹل میں اتریں۔ جب ٹیکسی انھیں اتار کر چلی گئی تو انھیں یاد آیا کہ ان کا ایک بیگ ٹیکسی میں چھوٹ گیا ہے۔ اس بیگ میں ان کا پاسپورٹ، رقم، کیمرا اور زیورات موجود تھے۔

احتیاطاً انھوں نے ٹیکسی کا نمبر نوٹ کر لیا تھا۔ انھوں نے ہوٹل والوں کو بتایا۔ ہوٹل والوں نے فوراً ٹرافک پولیس کے کنٹرول روم کو ٹیلی فون کیا اور ان کو ٹیکسی کا نمبر بتایا۔ کنٹرول روم نے اسی وقت وائرلیس کے ذریعہ پوری دہلی میں سڑکوں پر کھڑی ہوئی پولیس کو اس واقعہ کی خبر دیدی۔ پورے شہر میں ہزاروں نگاہیں گزرتی ہوئی ٹیکسیوں کا معائنہ کرنے لگیں۔ ابتدائی اطلاع کے صرف پندرہ منٹ کے اندر پولیس والوں نے ہوٹل کو بتایا کہ انھوں نے ٹیکسی کو پکڑ لیا ہے اور اس سے مذکورہ بیگ حاصل کر لیا ہے:

Within 15 minutes they telephoned to say
they had located the taxi and taken the bag.

میں نے اس واقعہ کو پڑھا تو مجھے قرآن کی وہ آیت یاد آگئی جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اے جن اور انسان کی جماعت، اگر تم سے ہو سکے تو تم آسمانوں اور زمین کی حدوں سے نکل جاؤ۔ تم نہیں نکل سکتے بغیر (خدا کی) سلطان کے۔ پھر تم اپنے رب کے کن کن کرشموں کو جھٹلاؤ گے۔ تم پر آگ کا شعلہ اور دھواں چھوڑا جائے گا تو تم اپنا بچاؤ نہ کر سکو گے۔ (الرحمٰن ۳۴-۳۵)

مخلوق ایسا کر سکتی ہے کہ وہ ترقی یافتہ مواصلات کے ذریعہ فوری طور پر پولیس کو مطلع کرے اور پولیس منٹوں کے اندر بھاگنے والے کا پتہ کر کے اس کو پکڑ لے۔ جب مخلوق کے اندر یہ طاقت ہے تو خالق کے اندر یہی طاقت مزید بے حساب گنا اضافہ کے ساتھ کمال درجہ میں موجود ہوگی۔ آدمی اگر اس پہلو کو سوچے تو اس کی زندگی میں اچانک انقلاب آجائے۔

میں کسی حال میں خدا کی پکڑ سے باہر نہیں، یہی احساس تمام اصلاحات کی جان ہے۔ اس کے بغیر کوئی حقیقی اصلاح ممکن نہیں۔

یہ فرق کیوں

کلیم اللہ خاں ایم ایس سی (پیدائش ۱۹۵۱) اور مشتاق احمد ریشی انجینیر (پیدائش ۱۹۵۱) دونوں سرینگر (کشمیر) کے رہنے والے ہیں۔ دسمبر کے نصف آخر میں وہ دہلی آئے۔ ۲۶ دسمبر ۱۹۸۹ کو ان سے اسلامی مرکز میں ملاقات ہوئی۔ ان سے میں نے پوچھا کہ دہلی کے بارے میں اپنے کچھ تجربات بتائیے۔

انھوں نے کہا کہ ہم لوگ کھاری باؤلی کے علاقہ میں گیے۔ وہاں شام ہوگئی۔ ہمیں کسی کو ٹیلی فون کرنا تھا۔ ہم کرانہ کے ایک دکاندار سے ملے۔ یہ ہندو تھا۔ اس کا دکان بند کرنے کا وقت ہوگیا تھا اور وہ اپنی دکان کی شٹر گرا رہا تھا۔ ہم نے کہا کہ ہمیں ایک ٹیلی فون کرنا ہے۔ وہ فوراً رک گیا اور کہا کہ آئیے کر لیجئے۔

ہم نے وہاں سے ٹیلی فون کیا۔ اتفاق سے بات لمبی ہوگئی۔ بات کر لینے کے بعد ہم نے جیب سے نوٹ نکالا اور دکاندار کو دیتے ہوئے کہا کہ معاف کیجئے، ہم نے آپ کا بہت وقت لیا۔ اس ہندو دکاندار نے پیسے نہیں لیے۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ بھائی صاحب، یہ تو آپ کی مہربانی ہے کہ آپ نے ہم کو خدمت کا موقع دیا۔ آپ کو اور ٹیلی فون کرنا ہے تو آپ اور بھی کر لیں۔ پیسہ دے کر ہمیں شرمندہ نہ کریں۔

اس کے بعد انھوں نے دہلی کے مسلمانوں کے بارہ میں اپنے کچھ تجربات بتائے جو اس کے بالکل برعکس تھے۔ دوسری قوم کے افراد سے اگر انھیں میٹھے بول کا تجربہ ہوا تھا تو مسلمانوں سے انھیں کڑوے بول کا تجربہ ہوا۔ انھوں نے مزید کہا کہ یہ کوئی وقتی یا اتفاقی بات نہیں ہے۔ یہی ہمارا مستقل تجربہ ہے۔

مشتاق احمد ریشی صاحب پہل گام میں ٹورسٹ ہٹ چلاتے ہیں۔ اس سلسلہ میں انھیں مسلمانوں اور غیر مسلموں، دونوں سے بار بار سابقہ پیش آتا ہے۔ اسی طرح کلیم اللہ خاں صاحب کا کشمیری شال کا کاروبار ہے۔ انھیں بھی برابر دونوں فرقہ کے لوگوں سے سابقہ پڑتا رہتا ہے۔

دونوں نے کہا کہ ہمارا عام تجربہ ہے کہ دوسری قوم کے لوگ نرم بات کرنے والے اور

خوش اخلاق ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس مسلمان گرم گفتار ہوتا ہے اور بہت جلد تشدد پر اتر آتا ہے۔ وہ اپنے سوا کسی اور کا لحاظ کرنا نہیں جانتا۔ اس سلسلہ میں متعدد واقعات بتانے کے بعد انھوں نے کہا کہ آخر مسلمانوں اور غیر مسلموں میں یہ فرق کیوں ہے۔

میں نے کہا کہ یہ تجربہ صرف آپ کا نہیں ہے۔ اس معاملہ میں بہت سے لوگوں کا تجربہ یہی ہے۔ سنجیدہ لوگ اکثر اس بارہ میں سوال کرتے رہتے ہیں۔ اس سلسلہ میں جو بات میری سمجھ میں آئی ہے، وہ یہ ہے کہ اس فرق کا سبب وہ مزاجی فرق ہے جو دونوں فرقوں کی الگ الگ نفسیات کی وجہ سے دونوں میں پیدا ہوا ہے۔

اصل یہ ہے کہ یہ فرق مسلمان اور غیر مسلمان کا نہیں ہے بلکہ یہ موجودہ مسلمان اور موجودہ غیر مسلمان کا فرق ہے۔ موجودہ مسلمانوں کا معاملہ یہ ہے کہ وہ ایک زوال یافتہ قوم ہیں۔ موجودہ مسلمانوں کی نفسیات اُن کے اِس بگڑے ہوئے عقیدہ کے تحت بنی ہے کہ ہم خدا کی خاص امّت ہیں، اس لیے ہم بہرحال نجات پائیں گے، خواہ ہم بے عمل یا بدعمل ہی کیوں نہ ہو۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ ہم پائیں گے، خواہ ہم کچھ نہ کریں۔ ہم کامیاب ہوں گے، خواہ ہم نے اس کے لیے ضروری کوشش نہ کی ہو۔

دوسری قوم کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ ان کا مقصد، مادی فائدہ حاصل کرنا یا مادی مواقع کو استعمال کرنا ہے۔ یہی وہ مقصد ہے جس کے تحت ان کی نفسیات بنی ہے۔ مادی دنیا میں نتیجہ ہمیشہ عمل کی بنیاد پر ملتا ہے۔ یہاں "عمل نہیں تو نتیجہ بھی نہیں" کا اصول کارفرما ہے۔ سر فلپ سڈنی (Sir Philip Sidney) نے اسی بات کو ان لفظوں میں کہا کہ کوئی چیز بھی اس وقت تک حاصل نہیں ہوتی جب تک اس کے لیے پوری پوری کوشش نہ کی جائے:

Nothing is achieved before it be throughly attempted.

یہ گویا دین مادیت کا کلمہ ہے۔ اور اسی کلمہ پر یقین کی وجہ سے دوسری قوم کے آدمی کے اندر یہ مزاج بنتا ہے کہ میں کروں گا تب پاؤں گا، کیے بغیر مجھے کچھ ملنے والا نہیں۔

اس فرق کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمان ہمیشہ جھوٹے بھرم میں رہتا ہے۔ وہ بیرونی حقیقت کی پروا کرنا نہیں جانتا۔ کیوں کہ اس کی مخصوص نفسیات اس کو بتا رہی ہوتی ہے کہ وہ بہرحال

کامیاب ہونے والا ہے، کوئی خارجی حقیقت اس کے مستقبل پر اثر انداز ہونے والی نہیں۔ اس کا پورا ماحول روزانہ اس کو یہی سبق دیتا رہتا ہے۔

اس کے برعکس دوسری قوم کا آدمی ہمیشہ حقیقت پسندی کے انداز میں سوچتا ہے۔ اس کا مادی ذہن ہر وقت اس کو یہ بتاتا رہتا ہے کہ کامیابی کوئی اپنے آپ ملنے والی چیز نہیں۔ کامیابی اس کو صرف اس وقت ملے گی جب کہ خارجی اسباب کو اس نے اپنے موافق بنایا ہو۔ اگر خارجی اسباب موافقت نہ کریں تو وہ کامیاب ہونے والا بھی نہیں۔

اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ موجودہ مسلمان تخیل پسند بن گیا ہے اور دوسری قوم کا آدمی حقیقت پسند۔ ایک بے صبر ہے اور دوسرا صبر دار۔ ایک طاقت نہ ہونے کے باوجود لڑپڑتا ہے اور دوسرا صرف اس وقت لڑتا ہے جب کہ اس کے پاس طاقت موجود ہو۔ ایک حالات کو جاننے کی فکر نہیں کرتا اور دوسرا حالات کو گہرائی سے جاننا اپنے لیے ضروری سمجھتا ہے۔ ایک اپنے کام کا آغاز اقدام سے کرتا ہے اور دوسرا اپنے کام کا آغاز تیاری سے۔

ایک کا حال یہ ہے کہ وہ زمانہ کی تبدیلیوں سے بے پروا رہتا ہے اور دوسرا زمانہ کی تبدیلیوں کو جان کر اس کے مطابق اپنا منصوبہ بناتا ہے۔ ایک بڑے بڑے الفاظ بول کر خوش ہوتا ہے اور اس کو بھی ایک کام سمجھتا ہے اور دوسرا عملی پہلوؤں کو اپنے موافق بنانے کو کام قرار دیتا ہے۔ ایک کے یہاں شاعری اور خطابت اور انشا پردازی کی دھوم ہے اور دوسرے کے یہاں سائنٹفک انداز اور سائنٹفک علوم پر توجہ دی جاتی ہے۔ ایک اکڑنے کو کمال سمجھتا ہے اور دوسرا جھک کر اپنا کام بنانے کی کوشش کرتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ موجودہ مسلمان کی نفسیات کا سرچشمہ اس کی اپنی گھڑی ہوئی خوش فہمیاں ہیں، اور غیر مسلم نفسیات کا سرچشمہ اٹل مادی حقائق۔ اس نفسیاتی فرق نے ایک کو خود فریبی کی زمین پر کھڑا کر دیا ہے، اور دوسرے کو حقیقت شناسی کی زمین پر۔ دونوں گروہوں کے مزاج کا یہ فرق اتنا واضح ہے کہ اس کو زندگی کے ہر شعبہ میں دیکھا جا سکتا ہے، خواہ وہ انفرادی سطح کا معاملہ ہو یا اجتماعی سطح کا معاملہ۔

نظام الدین بستی (دہلی) کے ایک مسلمان سے میں نے پوچھا کہ بستی میں کتنے مسلمان ہوں گے۔ انھوں نے کہا کہ ۹۰ فی صد سے زیادہ۔ میں نے کہا کہ بستی میں عام ضرورت کی چیزوں کی سب

سے بڑی دکان کس کی ہے ۔ انھوں نے کہا کہ ہندو کی ۔ میں نے کہا کہ جب بستی کے اندر زیادہ تر مسلمان آباد ہیں تو وہ لوگ دکان کیوں نہیں کرتے ۔ انھوں نے کہا کہ مسلمانوں کی بھی یہاں کئی دکانیں ہیں، مگر سب سے چلتی ہوئی دکان ہندو کی ہے ۔ اس کے یہاں ہر وقت بھیڑ لگتی ہے ۔

اس کی وجہ بتاتے ہوئے انھوں نے کہا کہ پہلے میں خود مسلمان دکانداروں سے سودا خریدتا تھا ۔ مگر ان کا معاملہ بہت خراب رہتا ہے ۔ چنانچہ اب میں زیادہ تر ہندو دکان ہی سے ضروری سودا خریدتا ہوں ۔ یہ کوئی استثنائی بات نہیں ۔ آپ کہیں بھی مسلم دکاندار سے خریداری کا تجربہ کیجیے ۔ اس کے بعد آپ غیر مسلم دکاندار کے یہاں سودا خریدنے جائیے ۔ آپ دونوں میں کھلا ہوا فرق پائیں گے ۔ ایک کے یہاں آپ کو بے پروائی اور تلخ کلامی ملے گی ، اور دوسرے کے یہاں ہمدردی اور شیریں کلامی ۔ یہی وہ فرق ہے جس نے تجارت میں مسلمانوں کو پیچھے اور غیر مسلموں کو آگے کر دیا ہے ۔

یہی فرق قومی اور اجتماعی سطح پر بھی پایا جاتا ہے ۔ ہندوؤں میں ایک طرف بال گنگادھر تلک (۱۹۲۰ - ۱۸۵۶) اٹھے جو آزادی کی تحریک کو تشدد کے انداز پر چلانا چاہتے تھے ۔ دوسری طرف مہاتما گاندھی (۱۹۴۸ - ۱۸۶۹) تھے جو عدم تشدد کے طریقہ پر چل کر آزادی حاصل کرنے کی بات کرتے تھے ۔ ہندو قوم نے تلک کو چھوڑ دیا اور گاندھی کو اپنا لیڈر بنا لیا ۔

ایک مشورہ

بالاصاحب دیورس راشٹریہ سوم سیوک سنگھ (آر ایس ایس) کے سرسنچالک ہیں۔ وہ اس ملک میں ہندوازم کے احیاء کے سرگرم اور مشہور علم بردار ہیں۔

انگریزی اخبار ٹائمس آف انڈیا (۱۶ نومبر ۱۹۸۷) کی رپورٹ کے مطابق، بالاصاحب دیورس نے جے پور میں ایک انٹرویو دیا۔ اس انٹرویو کے دوران، اخباری رپورٹر کے مطابق، انھوں نے اقرار کیا کہ ہندوازم میں بہت سی کمیاں ہیں، جیسے کہ چھوت چھات اور ذات پات کا رواج :

He, however, admitted that there were many flaws in Hindusim such as the prevalence of untouchability and casteism (p.1)

اب سوال یہ ہے کہ جو لوگ ہندوازم کا احیاء کرنا چاہتے ہیں وہ کس چیز کا احیاء کرنا چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب ہندوازم کا احیاء ہوگا تو اسی چیز کا احیاء ہوگا جو کہ ہندوازم میں پائی جارہی ہے۔ وہ کسی اور چیز کا احیاء نہیں بن سکتا۔

چھوت چھات کے سلسلہ میں بنیادی بات یہ ہے کہ وہ محض ایک سماجی رواج نہیں ہے۔ اس کی جڑ یہ ہے کہ چھوت چھات اور ذات پات کی تعلیم خود ہندوازم کی مقدس کتابوں میں موجود ہے۔ اس لیے جب ہندوازم کا احیاء کیا جائے گا تو اس کے یہ اجزاء بھی لازمی طور پر زندہ ہوں گے۔ ان کو ہندوازم کی احیاء کی اسکیم سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔

آپ اگر ۱۹۳۵ کے انگریزی ایکٹ کو زندہ کریں تو اسی کے ساتھ برطانوی بالادستی بھی لگی ہوئی آئے گی۔ یہ ناممکن ہے کہ ۱۹۳۵ کا ایکٹ زندہ کیا جائے اور اس سے عملاً موجودہ ہندستانی دستور برآمد ہو جس میں اس ملک کا اقتدار اعلیٰ کامل طور پر ملک کے عوام کے لیے تسلیم کیا گیا ہے۔ جب کہ ۱۹۳۵ کے ایکٹ میں ہندستان کے اقتدار اعلیٰ کو برٹش امپائر کا حق بتایا گیا تھا۔

ہندو مصلحین اس معاملہ میں ایک ناقابل حل تضاد کا شکار ہیں۔ اگر وہ ہندوازم کا نعرہ نہ لگائیں تو ان کو اندیشہ ہے کہ ہندو کسی اور مذہب یا تہذیب میں ضم ہو جائیں گے۔ اور اگر وہ ہندوازم کے نام پر انھیں ابھاریں تو اونچی ذات اور نیچی ذات جیسے جھگڑے نئی طاقت کے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں،

کیوں کہ یہ چیزیں ہندوازم کے ایسے لازمی اجزا ہیں جن کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔

مسٹر گرگی لال جین اور دوسرے ہندو دانشوروں نے اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ ہندو احیا پرستوں کے پاس کوئی مثبت بنیاد نہیں جس پر وہ قوم کو کھڑا کرسکیں۔ ان کے پاس صرف ایک منفی بنیاد (مسلم دشمنی) ہے جس پر وہ قوم کو کھڑا کر سکتے ہیں۔ مگر وہ کوئی پسندیدہ بنیاد نہیں۔

مسٹر جین نے بجا طور پر اس کو رد کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جو چیز ممکن ہے وہ مطلوب نہیں، اور جو چیز مطلوب ہے وہ ممکن نہیں۔

اس دوگونہ مشکل کا حل صرف ایک ہے۔ وہ یہ کہ ہندو مصلحین قومی طرز فکر کو چھوڑ کر حق پسندانہ طرز فکر کو اختیار کریں۔ اس کے بعد وہ اپنے آپ اس راستہ کو پالیں گے جس میں صداقت بھی ہو، اور جو ہر قسم کے تضادات سے خالی بھی ہو۔

اس دنیا میں آدمی کے لیے دو راستے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ تعصب کی زمین پر کھڑا ہو۔ دوسرے یہ کہ وہ حقیقت پسندی کی زمین پر کھڑا ہو۔ تعصب کی زمین وقتی طور پر کچھ لوگوں کو کھڑے ہونے کی زمین دے سکتی ہے۔ مگر اس میں نہ پائداری ہے اور نہ اس سے کوئی مسئلہ حل ہوتا ہے۔ اس کے برعکس حقیقت پسندی کی زمین میں پائداری بھی ہے اور وہ ہر قسم کے تضادات سے پاک بھی ہے۔

آدمی کو چاہیے کہ وہ تعصب اور تنگ نظری کے طریقے سے بچے اور حقیقت پسندی کی بنیاد پر اپنے مستقبل کی تعمیر کرے، کیوں کہ بالآخر جس چیز کو کامیابی ملنے والی ہے وہ حقیقت پسندی ہے نہ کہ تعصب اور تنگ نظری۔

کامیاب مقابلہ

مولانا ثناراللہ امرتسری (۱۹۴۸ - ۱۸۶۸) اپنے وقت کے مشہور مناظر تھے۔ ایک بار دہلی میں ان کا مناظرہ آریہ سماج کے ایک ہندو عالم سے ہوا۔ اس زمانہ میں مولانا ثناراللہ کے ایک مخالف نے ان کے بارہ میں ایک اشتہار شائع کیا تھا۔ اس اشتہار میں مولانا ثناراللہ کی طرف کچھ ایسی باتیں منسوب کی گئی تھیں جس سے ان کا اسلام ہی مشکوک قرار پا رہا تھا۔

یہ اشتہار آریہ سماجی مناظر کو مل گیا۔ وہ عربی اور فارسی زبانیں جانتا تھا اور عقیدہ اور عمل کے بارہ میں علماء اسلام کے اختلافی مسائل سے بخوبی آگاہ تھا۔ اس نے مذکورہ اشتہار کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ دونوں فریق جب مناظرہ کے اسٹیج پر آئے تو آریہ سماجی مناظر نے پہلا کام یہ کیا کہ وہ اپنی جگہ سے اٹھا۔ اس کے ہاتھ میں مذکورہ اشتہار تھا۔ اس اشتہار کو اس نے مجمع کے سامنے لہراتے ہوئے کہا :

حضرات ، میں تو یہاں کسی مسلمان عالم دین سے مناظرہ کرنے کے لیے آیا ہوں۔ مگر مولانا ثناراللہ امرتسری اس صف میں شامل نہیں۔ مولانا صاحب ایک انسان کی حیثیت سے میرے لیے قابلِ احترام ہیں۔ لیکن اس اشتہار کو دیکھئے۔ اس کے مطابق خود اسلامی جماعت کے لوگ ان کے اسلام کو تسلیم نہیں کرتے۔ پھر میں کیسے انھیں مسلمان سمجھوں اور اسلام کے بارہ میں ان سے مناظرہ کروں۔

مولانا ثناراللہ امرتسری نے اس پر کسی منفی رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔ وہ اطمینان کے ساتھ مسکراتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھے اور کہا۔ حضرات ، میرے دوست نے ٹھیک کہا۔ مگر آپ سب جانتے ہیں کہ اسلام میں داخل ہونے کے لیے کلمہ شہادت پڑھنا کافی ہے۔ کلمہ پڑھ کر اسلام میں داخل ہوا جاتا ہے۔ میں آپ تمام حاضرین کو گواہ بنا کر آپ کے سامنے کلمۂ شہادت پڑھتا ہوں اور اسلام قبول کرتا ہوں۔ اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ ۔ اب تو میرے اسلام میں کوئی شک نہیں رہا۔ آئیے ، اب مناظرہ کیجیے۔

مولانا ثناراللہ امرتسری اگر اشتہار کے مضمون پر کلام کرتے اور اپنے آپ کو مسلمان ثابت کرنے لگتے تو بات کبھی ختم نہ ہوتی۔ وہ عقیدہ و عمل کے پیچیدہ بحثوں میں الجھ کر رہ جاتے۔ ہندو مناظر اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا۔ مگر مذکورہ انداز اختیار کر کے انھوں نے ایک منٹ میں سارا مسئلہ ختم کر دیا۔

المطففین

قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ تم ناپ اور تول کو پورا کرو انصاف کے ساتھ ، اور لوگوں کو ان کی چیزیں گھٹا کر نہ دو اور زمین میں فساد کرتے نہ پھرو (ہود ۸۵) جب تم ناپ کر دو تو پورا ناپو اور ٹھیک ترازو سے تول کر دو ۔ یہ بہتر طریقہ ہے اور اس کا انجام اچھا ہے (بنی اسرائیل ۳۵) تم لوگ پورا پورا ناپو اور نقصان دینے والوں میں سے نہ بنو ۔ اور سیدھی ترازو سے تولو اور لوگوں کو ان کی چیزیں گھٹا کر نہ دو اور زمین میں فساد نہ پھیلاؤ (الشعراء ۸۳ - ۱۸۱) اللہ نے آسمان کو اونچا کیا اور اس نے ترازو رکھ دی کہ تم تولنے میں زیادتی نہ کرو ، اور انصاف کے ساتھ سیدھی ترازو تو لو اور تول میں نہ گھٹاؤ (الرحمٰن ۷ - ۹)

ان آیتوں میں جس چیز سے روکا گیا ہے ، وہ قرآن کی زبان میں تطفیف ہے ۔ قرآن کی سورہ نمبر ۸۳ میں اس کی بابت زیادہ سخت الفاظ میں حکم دیتے ہوئے ارشاد ہوا ہے کہ خرابی ہے ناپ تول میں کمی کرنے والوں کے لئے ، جن کا حال یہ ہے کہ وہ لوگوں سے ناپ کر لیں تو پورا لیں ، اور جب لوگوں کو ناپ کر یا تول کر دیں تو انھیں گھٹا کر دیں ۔ کیا ایسا کرنے والے یہ نہیں سمجھتے کہ وہ اٹھائے جانے والے ہیں ، ایک بڑے دن کے لئے ۔ جس دن تمام انسان خداوند عالم کے سامنے کھڑے ہوں گے (التطفیف ۱ - ۶)

ویلٌ للمطففین کی تشریح مفسر النسفی نے ان الفاظ میں کی ہے کہ وہ لوگ جو انسانوں کے حقوق کو ناپنے اور تولنے میں گھٹا دیتے ہیں (للذین یبخسون حقوق الناس فی الکیل و الوزن) اس آیت کا تعلق صرف ان چند افراد سے نہیں ہے جو دکانداری کرتے ہوں اور ترازو میں تول کر کوئی چیز بیچ رہے ہوں ، بلکہ اس کا تعلق تمام انسانوں سے ہے ۔ ناپ اور تول سے مراد دراصل انسانی حقوق کی ادائگی ہے ۔ یہاں ترازو کی مثال سے بتایا گیا ہے کہ لین اور دین دونوں برابر رکھو ۔ جس طرح تم اپنا حق پورا لینا چاہتے ہو ، اسی طرح دوسروں کو بھی ان کا پورا حق دو ۔ یہ طریقہ نہ اختیار کرو کہ اپنے لئے دوسرا باٹ اور غیروں کے لئے دوسرا باٹ ۔

اس اخلاقی کمزوری کا اظہار سب سے زیادہ اختلاف والے معاملات میں ہوتا ہے ۔ ایک شخص

کا دوسرے شخص سے مال یا جائداد کا جھگڑا ہو۔ اس سے آپ بات کریں تو وہ پوری کہانی کو یک طرفہ انداز میں بتائے گا جس سے ثابت ہو کہ وہ حق پر ہے اور دوسرا شخص ناحق پر۔ یہی تطفیف ہے جس پر ویل (خرابی) کی خبر دی گئی ہے۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ پورے معاملہ کو جیسا ہے ویسا (as it is) بیان کرے، خواہ وہ اپنے موافق ہو یا اپنے خلاف۔

یہی حال تمام اختلافی امور کا ہے۔ آدمی اگر دوسرے کی زیادتی کو بتائے اور اپنی زیادتی کا ذکر نہ کرے تو وہ مطفف ہے، اور مطفف کے لئے اللہ تعالیٰ کے یہاں نہایت برے انجام کا اندیشہ ہے۔ وہ اپنی یک طرفہ باتوں سے دنیا والوں کو دھوکے میں ڈال سکتا ہے، مگر وہ خدا کو دھوکا نہیں دے سکتا۔

اس ذہنیت کا سب سے بڑا اظہار آج کل فرقہ وارانہ فساد کے معاملہ میں ہو رہا ہے۔ ہندستان میں پچھلے پچاس برس سے ہندو مسلم فساد ہو رہے ہیں۔ ان فسادات کی تعداد، چھوٹے اور بڑے واقعات کو ملا کر، ۵۰ ہزار سے کم نہیں ہوگی۔ ہر بار جب کہیں فساد ہوتا ہے تو مسلمانوں کی طرف سے اس کی رپورٹیں شائع کی جاتی ہیں۔ یہ نام نہاد رپورٹیں، تقریباً سب کی سب، تطفیف کی مثال ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان رپورٹوں میں ہمیشہ فریق ثانی کی زیادتیوں کو بیان کیا جاتا ہے۔ فریق اول نے کیا کیا، اس کا ان رپورٹوں میں کوئی ذکر نہیں ہوتا۔

مثال کے طور پر ۲۴ اکتوبر ۱۹۸۹ کو ایک شہر میں فساد ہوا۔ اس کی ابتدا یہاں سے ہوئی کہ ہندو فرقہ کے کچھ لوگ اپنا ایک مذہبی جلوس نکال رہے تھے۔ ان کے نقشہ کے مطابق جلوس کو ایک ایسی سڑک سے گزرنا تھا جس پر مسلم محلہ واقع تھا اور مسلمانوں کی مسجدیں تھیں۔ مسلمانوں نے روٹ بدلنے پر اصرار کیا۔ دوسری طرف ہندوؤں کا اصرار تھا کہ وہ اسی روٹ پر جائیں گے۔

اس واقعہ کے صرف ایک ماہ بعد، ۲۲ نومبر ۱۹۸۹ کو ملک کا جنرل الکشن ہونے والا تھا۔ حکمراں پارٹی کو دونوں فرقہ کا ووٹ لینا تھا، اس لئے وہ نہ ہندوؤں کو ناراض کرنا چاہتی تھی اور نہ مسلمانوں کو۔ چنانچہ حکومت نے یہ انتظام کیا کہ جلوس کو پولیس کے خصوصی بندوبست کے تحت نکالا جائے۔

جلوس اس طرح چلتا ہوا مسلم محلہ والی سڑک پر پہنچا۔ بھاری تعداد میں پولیس کی موجودگی اس بات کی ضمانت تھی کہ جلوس کے لوگ خواہ الٹے قسم کے نعرے لگائیں مگر وہ مسلمانوں کے خلاف کوئی عملی تشدد

نہ کر سکیں گے۔ مگر مسلمانوں نے ناقابل فہم نادانی کے تحت یہ کیا کہ وہ اپنے محلہ والی سڑک پر جمع ہوگئے اور جلوس کو روک دیا۔ اس طرح کئی گھنٹے تک جلوس وہاں رکا رہا۔ جب جلوس والے واپسی پر راضی نہ ہوئے تو مسلمانوں نے دوسری نادانی یہ کی کہ اپنے گھروں کی چھتوں سے جلوس پر بم پھینکے حتی کہ انھوں نے مبینہ طور پر پولیس کو بھی اپنے بم کا نشانہ بنایا۔

یہاں پہنچ کر سارا معاملہ بالکل بدل گیا۔ بم اور پتھراؤ سے پہلے سارا معاملہ انتظام کا معاملہ تھا، اب وہ غصہ اور انتقام کا معاملہ بن گیا۔ اس سے پہلے ایک طرف پولیس تھی اور دوسری طرف جلوس کے ہندو۔ مگر اب پولیس اور ہندو ایک طرف ہوگئے اور مسلمان دوسری طرف۔ جن مسلمانوں کی حیثیت پہلے زیر حفاظت فرقے کی تھی، ان کی حیثیت اب زیر انتقام فرقے کی بن گئی۔ پولیس نے اور ہندوؤں نے مشتعل ہو کر مسلمانوں کو مارنا اور پھونکنا شروع کر دیا جس کی تفصیل اخبارات میں آچکی ہے۔ جب آدمی غصہ میں آجائے تو وہ اس وقت وہ سب کچھ کرتا ہے جو اس کے بس میں ہو۔ چنانچہ ہندو اور پولیس والے جب غصہ میں آگئے تو انھوں نے وہ سب کچھ کیا جو وہ کر سکتے تھے۔

۲۴ اکتوبر کے اس فساد پر مسلم رہنماؤں اور مسلم دانشوروں کی طرف سے سیکڑوں "رپورٹیں" اخبارات ورسائل میں آچکی ہیں۔ مگر یہ تمام کی تمام رپورٹیں تطفیف کی مثال ہیں۔ ان میں واقعہ کے نصف ثانی کو بیان کیا گیا ہے، مگر واقعہ کے نصف اول کا ان نام نہاد رپورٹوں میں کوئی ذکر نہیں۔

جو لوگ اس قسم کی رپورٹیں یا "آنکھوں دیکھا حال" بیان کرتے ہیں۔ وہ وہی ہوتے ہیں جو فساد کا واقعہ ہو جانے کے بعد سفر کر کے وہاں پہنچتے ہیں۔ مثلاً فساد کا آغاز اگر ۲۴ اکتوبر کو ہوا اور اس کا سلسلہ کچھ دنوں تک جاری رہا تو ایسے لوگ ہمیشہ فساد کے بعد، مثلاً ۱۰ نومبر کو فساد زدہ مقام پر پہنچیں گے۔ اس وقت جو منظر ان کی آنکھوں کے سامنے ہوگا، بس وہ اسی کو جذباتی انداز میں بیان کرنا شروع کر دیں گے۔ یعنی وہ اپنی رپورٹ ۱۰ نومبر سے شروع کریں گے نہ کہ ۲۴ اکتوبر سے۔ اس قسم کی رپورٹیں یا اس قسم کے بیانات مکمل طور پر تطفیف کی مثال ہیں۔ یہ اپنے آپ کو اخفاء واقعہ کے باٹ سے تولنا ہے اور فریق ثانی کو اظہار واقعہ کے باٹ سے۔ اور قرآن کا فیصلہ ہے کہ جو لوگ تطفیف کا طریقہ اختیار کریں ان کے حصہ میں ویل (خرابی) لکھی جائے نہ کہ اصلاح اور کامیابی۔

پچھلے پچاس برس کی تاریخ قرآن کے ان الفاظ کی تصدیق کرتی ہے۔ اس مدت میں مسلم رہنماؤں

اور دانشوروں کی طرف سے لاکھوں کی تعداد میں رپورٹیں اور بیانات شائع کئے گئے ہیں۔ مگر ان رپورٹوں اور بیانات کا ایک فیصد فائدہ بھی ملت کو نہیں ملا، حتی کہ اتنا فائدہ بھی نہیں جتنا ان کے چھاپنے اور تقسیم کرنے پر خرچ کیا جاتا رہا ہے۔ فسادات، اپنی کیفیت اور کمیت دونوں اعتبار سے برابر جاری ہیں بلکہ اور بڑھتے جارہے ہیں۔

مسلم رہنما اگر ایسا کرتے کہ وہ فرقہ وارانہ فساد کا نصف ثانی بتانے کے ساتھ، اس کا نصف اول بھی بتاتے تو انھیں اللہ کی مدد حاصل ہوتی اور یقینی طور پر اب تک اس قسم کے فساد کا خاتمہ ہوجاتا۔

موجودہ قسم کی رپورٹیں اور بیانات کو پڑھ کر ہر جگہ کے مسلمانوں میں صرف غصہ اور نفرت کے جذبات پیدا ہو رہے ہیں۔ اور غصہ اور نفرت یقینی طور پر اصل مسئلہ کو مزید بڑھانے والا ہے، وہ ہرگز اس کو کم کرنے والا نہیں۔

اس کے برعکس اگر ہماری رپورٹوں اور بیانات میں واقعہ کا نصف اول بھی پوری طرح بیان کیا جاتا تو اس کے بعد مسلمانوں میں یہ احساس ابھرتا کہ اگر انھوں نے غلطی کی تو ہم نے بھی غلطی کی تھی۔ دونوں میں مقدار کا فرق تو ضرور ہے، مگر دونوں میں نوعیت کا کوئی فرق نہیں۔ یہ معاملہ یک طرفہ معاملہ نہیں ہے، بلکہ وہ دو طرفہ معاملہ ہے۔

اس احساس کا ایک تعمیری فائدہ یہ ہوتا کہ مسلمانوں میں خود احتسابی کا جذبہ ابھرتا۔ انھیں نظر آتا کہ فسادات کی شدت کے باوجود، ان کا ایک آسان حل بھی یہاں موجود ہے۔ وہ یہ کہ ہم اپنے حصہ کی غلطی کو ختم کردیں۔ اس طرح قانون قدرت کے تحت، ہم یہ امید کرسکتے ہیں کہ ان شاء اللہ دوسرے کی غلطی کا بھی خاتمہ ہوجائے گا۔

اس طرح کے مواقع پر بہترین حل یہ ہے کہ جب بھی کسی مقام پر فرقہ وارانہ تناؤ پیدا ہو تو مسلمان مقامی ذمہ داروں اور پولیس کے اعلیٰ افسران سے ربط قائم کریں۔ وہ منصوبہ بند طور پر اس بات کی کوشش کریں کہ معاملہ پولیس اور جلوس کے درمیان رہے۔ مگر مسلمان اپنی بے صبری سے خود ہی اقدام کر بیٹھتے ہیں۔ اس طرح بے بنیاد طور پر مسئلہ مسلمانوں اور پولیس کا بن جاتا ہے۔ مسلمان اگر اس راز کو جان لیں تو اس کے بعد ۹۹ فیصد فسادات کا علاج اپنے آپ ہوجائے گا۔

ایک تجربہ

جناب محفوظ علی خاں صاحب (پیدائش ۱۹۵۴ء) دہلی میں پلاسٹک انڈسٹریز کا کام کرتے ہیں۔ یکم مئی ۱۹۹۰ کی ملاقات میں انھوں نے اپنا ایک ذاتی تجربہ بتایا۔

دہلی کے شمالی حصہ میں گھونڈلی نام کا ایک علاقہ ہے۔ یہاں زیادہ تر ہندو گوجر رہتے ہیں۔ ایک گوجر کا ایک بڑا مکان ہے جو ساڑھے پانچ سو مربع گز میں واقع ہے۔ اس میں تقریباً دس مسلمان کرایہ دار ہیں۔ محفوظ علی خاں صاحب کے پاس بھی تقریباً ۲۰ سال سے اس کے تین کمرے کرایہ پر ہیں۔ مکان کے مالک نے اس کو دوسرے گوجر کے ہاتھ بیچ دیا۔ اب سابقہ مالک اور نئے مالک نے مل کر کرایہ داروں پر دباؤ ڈالنا شروع کیا کہ وہ اس کو خالی کر دیں۔ انھوں نے ان لوگوں کو طرح طرح کی دھمکیاں دیں۔

ایک روز تقریباً ۲۰ گوجر جمع ہو کر آئے اور کہا کہ مکان خالی کرو ورنہ ہم ڈنڈے کے زور پر تم لوگوں کو یہاں سے نکال دیں گے۔ حتیٰ کہ انھوں نے اشتعال انگیز باتیں کیں۔ مثلاً یہ کہ مسلمان قوم غدار ہے۔ مسلمان احسان فراموش ہوتے ہیں۔ وغیرہ۔

محفوظ علی صاحب اور دوسرے مسلمانوں نے کہا کہ ہم خالی کرنے کے لئے تیار ہیں مگر یہاں ہمارے تجارتی معاملات ہیں۔ ان کو نپٹانے میں وقت لگے گا۔ ہم کو ایک سال کی مہلت دو۔ اس کے بعد ہم ضرور خالی کر دیں گے۔

گوجر لوگ مہلت دینے پر راضی نہیں ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ تم لوگ نہیں مان رہے ہو تو ہم پنڈت لوگوں کو بلاتے ہیں۔ یہ "پنڈت" دراصل ایک بڑا خاندان ہے جو یہاں رہتا ہے۔ وہ لوگ پراپرٹی ڈیلر ہیں اور پیسہ والے ہیں۔ ان کا تعلق بھارتیہ جنتا پارٹی سے ہے۔ عام طور پر ان کو گوڑ کہا جاتا ہے۔ وہ معاشی اور سیاسی دونوں لحاظ سے طاقتور ہیں۔

گوجروں کے بلانے پر کچھ گوڑ (پنڈت) موقع پر آئے۔ انھوں نے دونوں طرف کی باتیں سنیں۔ آخر میں انھوں نے گوجروں سے کہا کہ کرایہ دار لوگ اگر ایک سال کا وقت مانگ رہے ہیں تو ان کا کہنا جائز ہے۔ پھر تم کیوں ان کے ساتھ زبردستی کر رہے ہو۔

گوجروں نے یہ سنا تو وہ پنڈتوں پر غصہ ہو گئے۔ انھوں نے کہا کہ تم کو ہم نے اپنی مدد کے لئے بلایا تھا اور تم یہاں آکر خود ہمارے خلاف فیصلہ کر رہے ہو۔ اب وہ پنڈتوں کو برا بھلا کہنے لگے۔ ایک گوجر نے اپنی مونچھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا کہ اب ہم خود خالی کرائیں گے۔ ۱۶ لاکھ میں اس کو خریدا ہے، ۱۶ لاکھ اوپر سے اور لگا دیں گے۔ اور خالی کرا کے چھوڑیں گے۔

پنڈت لوگوں نے یہ سنا تو وہ بھی غصہ ہو گئے اور یہ کہہ کر چلے گئے کہ کرایہ داروں نے تو جائز بات کہی تھی۔ مگر تم لوگ دھاندلی کر رہے ہو تو اب ہم بھی دیکھ لیں گے کہ تم کیسے خالی کراتے ہو۔

گھونڈلی میں پنڈت لوگوں کا ایک اسکول ہے جس کا نام سناتن دھرم مڈل اسکول ہے۔ یہاں آٹھویں تک تعلیم ہوتی ہے۔ محفوظ صاحب کی بچی یہاں ساتویں کلاس میں پڑھ رہی تھی۔ جب مکان کا جھگڑا پیدا ہوا تو محفوظ صاحب نے احتیاط کے طور پر یہ طے کیا کہ بچی کو اس اسکول سے نکال لیں اور اس کا داخلہ دوسری جگہ کرائیں۔ کیوں کہ پتہ نہیں کب یہاں کا مکان چھوڑنا پڑے۔

محفوظ صاحب ۱۶ اپریل ۱۹۹۰ کو اسکول گئے تاکہ بچی کا نام وہاں سے کٹوا دیں اور لیونگ سرٹیفکیٹ حاصل کریں۔ اس وقت اسکول کے منیجر (سری گوڑ) وہاں موجود تھے۔ انھوں نے پوچھا کہ آپ اپنی بچی کو کیوں یہاں سے نکال رہے ہیں۔ محفوظ صاحب نے کہا کہ گوجر لوگوں نے مکان کا جھگڑا کھڑا کر دیا ہے، وہ زبردستی مکان خالی کروانا چاہتے ہیں۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ بچی کی تعلیم کا بندوبست کہیں اور کر دوں۔

سری گوڑ نے کہا کہ اگر آپ اس وجہ سے بچی کا نام کٹوا رہے ہیں تو آپ ہرگز ایسا نہ کریں۔ کیا اس ملک میں کوئی قانون نہیں ہے۔ وہ لوگ کیسے خالی کرا لیں گے۔ آپ اپنے مکان میں رہئے۔ ہم سب لوگ آپ کے ساتھ ہیں۔ اور اگر خالی کرنا ہوا تو سیدھے سیدھے نہیں خالی کیا جائے گا۔ خالی کروانے والوں کو دو دو لاکھ روپیہ دینا ہوگا۔

پوری آبادی میں یہ بات پھیل گئی کہ پنڈت لوگ مسلمانوں کا ساتھ دے رہے ہیں۔ محفوظ صاحب نے بتایا کہ اب وہ لوگ ہمارے مشیر بن گئے۔ حتی کہ ایک پنڈت نے کہا کہ اگر پیسہ کی ضرورت پڑی تو ہم پیسہ بھی خرچ کریں گے اور آپ کو جتائیں گے۔

پنڈت لوگوں کے مشورہ پر محفوظ صاحب نے اس معاملہ کی رپورٹ تھانہ میں درج کرائی

اور کورٹ میں اس پر مقدمہ کر دیا۔ اب یہ معاملہ عدالت میں ہے۔ گوجر لوگ اگرچہ فرضی دھمکیاں دیتے ہیں۔ مگر اب ان کا زور ٹوٹ چکا ہے۔ ایک بار محفوظ صاحب گھر آئے تو انھیں معلوم ہوا کہ گوجر لوگ آئے تھے اور مسلمانوں کو دھمکی دے رہے تھے کہ ہم ڈنڈے کے زور پر خالی کرائیں گے۔ محفوظ صاحب اس گوجر سے ملے جس نے ایسی بات کہی تھی۔ گوجر نے فوراً بات بدل دی۔ اس نے کہا مجھ سے قسم لے لو، اس کے کیڑے پڑیں جس نے ایسا کہا ہو۔

اب یہ معاملہ عدالت میں ہے۔ پنڈت لوگوں کی مداخلت کے بعد گوجروں کا زور ٹوٹ چکا ہے۔ تقریباً یقینی ہے کہ مصالحت اور راضی نامہ کے ذریعہ شریفانہ انداز میں اس کا فیصلہ ہو جائے گا۔

محفوظ علی خاں صاحب کو یہ کامیابی اس لئے ملی کہ وہ اشتعال انگیزی کے باوجود مشتعل نہیں ہوئے۔ خود نہ بول کر انھوں نے فطرت کو بولنے کا موقع دیا۔ نامعقولیت کے جواب میں معقولیت کا رویہ اختیار کر کے انھوں نے خود دوسری قوم کے اندر اپنے ہمدرد پالئے۔ یہی اس دنیا میں کامیابی کا طریقہ ہے، خواہ مسئلہ مسلمانوں اور مسلمانوں کے درمیان ہو یا مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان۔

انتقام نہیں

کسی کا قول ہے ——— "انتقام لینے سے پہلے سوچ لو کہ انتقام کا بھی انتقام لیا جائے گا۔" یہ زندگی کی نہایت گہری حقیقت ہے۔ اور اس حقیقت کو سمجھنے کے بعد ہی کوئی شخص موجودہ دنیا میں اپنے لئے کامیاب زندگی بنا سکتا ہے۔

ایک شخص سے آپ کو تکلیف پہنچی۔ آپ کے دل میں اس کے خلاف انتقام لینے کا جذبہ بھڑک اٹھا۔ آپ چاہنے لگے کہ اس سے بدلہ لے کر اپنے سینہ کی آگ ٹھنڈی کریں۔ مگر سوچنے کی بات یہ ہے کہ ایک شخص کے تکلیف دینے سے آپ کے اندر انتقام کا جذبہ بھڑک اٹھا، پھر وہی تکلیف جب آپ اس شخص کو دیں گے تو کیا اس کے اندر دوبارہ انتقام کا جذبہ نہیں بھڑکے گا۔ یقیناً ایسا ہی ہوگا۔ اور پھر برائی کا ایک چکر چل پڑے گا۔ آپ کو ایک تکلیف کے بعد دوسری تکلیف سہنی پڑے گی۔ اس لئے عقلمندی یہ ہے کہ نظر انداز کرنے کا طریقہ اختیار کرکے بات کو پہلے ہی مرحلہ میں ختم کر دیا جائے۔

میری ملاقات ایک بار یوپی کے ایک شخص سے ہوئی۔ اس نے ایک نیتا کی شرکت میں ایک بس خریدی۔ اس آدمی نے پیسہ لگایا۔ اور نیتا نے لائسنس حاصل کیا۔ لائسنس قانونی طور پر نیتا کے نام تھا۔ مگر نفع میں دونوں برابر کے شریک تھے۔

کچھ دنوں کے بعد نیتا کی نیت بگڑی۔ اس نے سوچا کہ قانونی طور پر گاڑی میری ہے کیوں کہ لائسنس میرے نام ہے۔ پھر میں اس کا نفع دوسرے کو کیوں دوں۔ اس نے یک طرفہ طور پر گاڑی پر قبضہ کر لیا۔

اب آدمی بہت غصہ ہوا۔ اس کے اندر انتقام کی آگ بھڑک اٹھی۔ اس نے ارادہ کیا کہ نیتا کو قتل کر ڈالے۔ چنانچہ وہ اس کے قتل کا منصوبہ بنانے لگا۔ اس دوران اس کی ملاقات ایک بوڑھے تجربہ کار آدمی سے ہوئی۔ حالات سننے کے بعد بوڑھے آدمی نے کہا کہ اگر تم اپنے منصوبہ کے مطابق نیتا کو مار ڈالو تو اس کے بعد اس کے بچے کیا تم کو زندہ چھوڑ دیں گے۔

یہ بات آدمی کی سمجھ میں آگئی۔ اس نے نیتا کو مارنے کا ارادہ چھوڑ دیا۔ اس کے بجائے اس نے یہ کیا کہ اس کے پاس جو رقم اب بھی باقی تھی اس سے چھوٹے پیمانہ پر بزنس شروع کر دیا۔ چند سال بعد جب اس آدمی سے میری ملاقات ہوئی تو اس نے کہا کہ میں بہت خوش ہوں۔ بس کی شرکت سے میں جتنا

کماتا تھا، اب میں اس سے زیادہ کما رہا ہوں۔ اور میرا کاروبار برابر ترقی کر رہا ہے۔

جب بھی آپ کے سینہ میں کسی کے خلاف انتقام کی آگ بھڑکے تو اپنے ذہن کو ٹھنڈا کر کے سب سے پہلے یہ سوچئے کہ میرا فائدہ انتقام لینے میں ہے یا انتقام نہ لینے میں۔

ظاہر ہے کہ دوسرے کو نقصان پہنچانا بذات خود کوئی مقصد نہیں۔ اصل مقصد جو ہر آدمی اپنے سامنے رکھتا ہے یا اس کو رکھنا چاہئے، وہ اپنے آپ کو فائدہ پہنچانا ہے۔ اگر دوسرے کو نقصان پہنچانے کا نتیجہ یہ ہو کہ آخر میں آپ کو خود اس سے بڑا نقصان اٹھانا پڑے، تو ایسی حالت میں عقلمندی کیا ہے۔ اگر آپ ٹھنڈے دماغ سے سوچیں تو آپ یہ ماننے پر مجبور ہوں گے کہ ایسی کارروائی جو آخر میں خود اپنے خلاف پڑنے والی ہو، وہ کسی بھی حال میں صحیح نہیں کہی جا سکتی۔ ایسی ہر کارروائی صرف بے وقوفی ہے نہ کہ وہ کام جو ایک عقلمند آدمی کو کرنا چاہئے۔

ہمارے سماج میں جو جھگڑے ہیں اور عدالتوں میں جو مقدمات کی بھرمار ہے وہ سب اسی انتقامی جذبہ کا نتیجہ ہے۔ لوگ شکایت یا تکلیف کی کوئی بات پیش آنے کے بعد اس کو بھلا نہیں پاتے۔ وہ فوراً ردعمل کا شکار ہو جاتے ہیں اور جوابی کارروائی کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

اس طرح جو جھگڑے اور مقدمے بڑھتے ہیں اس کا نقصان صرف فریق ثانی کو نہیں پہنچتا بلکہ اس شخص کو بھی پہنچتا ہے جس نے جوابی کارروائی کر کے دوسرے کے خلاف بدلہ لینا چاہا تھا۔

ہر آدمی سکون کی زندگی چاہتا ہے۔ ہر آدمی یہ چاہتا ہے کہ اس کا سماج امن و امان کا سماج ہو۔ یہ مقصد اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب کہ لوگوں کے اندر بدلہ نہ لینے کا مزاج پیدا ہو جائے۔ یہی ہمارے مسئلہ کا واحد حل ہے۔ اسی سے ہر آدمی کو ذاتی سکون حاصل ہو سکتا ہے۔ اور پورا سماج بھی اسی کے ذریعہ امن و امان کا گہوارہ بن سکتا ہے۔

جب بھی آپ کسی سے انتقام لیں تو انتقام لینے میں آپ اپنی طاقت خرچ کرتے ہیں۔ وقت اور پیسہ کی کافی مقدار خرچ کئے بغیر کوئی شخص دوسرے سے انتقام نہیں لے سکتا۔ اگر بالفرض آدمی انتقام لینے میں کامیاب ہو جائے تب بھی انتقام لے کر اس کو جو چیز حاصل ہوتی ہے وہ صرف ایک نفسیاتی تسکین ہے۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

لیکن یہی وقت اور یہی رقم اگر کسی مثبت چیز کو حاصل کرنے میں لگا دیا جائے تو وہ نفع کے ساتھ

آدمی کی طرف لوٹتا ہے ۔ جیسا کہ مذکورہ شخص کے ساتھ پیش آیا۔ انتقام لینے میں طاقت کو خرچ کرنا طاقت کو کھونا ہے ، اور ایک مثبت کام میں طاقت لگانا ، طاقت کو مزید اضافہ کے ساتھ دوبارہ پا لینا ہے۔ ایسی حالت میں یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ عقل مند آدمی کو دونوں میں کون سا طریقہ اختیار کرنا چاہئے ۔

حقیقت پسندی

کسی کا قول ہے کہ ــــــ "اپنے حق سے زیادہ چاہنا اپنے آپ کو اپنے واقعی حق سے بھی محروم کر لینا ہے "۔ کوئی آدمی جب اتنا ہی چاہے جس کا وہ واقعی طور پر حق دار ہے تو ہر چیز اس کی مانگ کی تصدیق کر رہی ہوتی ہے۔ اور جب وہ اپنے واقعی حق سے زیادہ چاہنے لگے تو ہر چیز اس کے خلاف ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پہلا آدمی ہمیشہ کامیاب ہوتا ہے۔ اور دوسرا آدمی ہمیشہ ناکام۔

ایک بڑا ادارہ تھا۔ اس میں ایک منیجر کی ضرورت تھی۔ ایک آدمی کے اندر انتظامی صلاحیت تھی۔ چنانچہ اس آدمی کو وہاں منیجر کی حیثیت سے رکھ لیا گیا۔ ادارہ کے ڈائرکٹر نے منیجر کے ساتھ کافی رعایت کا معاملہ کیا۔ معقول تنخواہ ، رہنے کے لئے مکان ، آنے جانے کے لئے ایک جیپ ، اور دوسری کئی چیزیں انھیں حاصل ہو گئیں۔

مگر کچھ دنوں کے بعد اس آدمی کے ذہن میں زیادہ کی حرص پیدا ہو گئی۔ "منیجر" کی حیثیت اس کو کم لگی ، اس نے چاہا کہ ڈائرکٹر کی سیٹ پر قبضہ کر لے۔ اب منیجر نے چپکے چپکے ڈائرکٹر کے خلاف منصوبہ بنایا۔ مگر منصوبہ کی کامیابی سے پہلے ڈائرکٹر کو اس کی خبر ہو گئی۔ اس نے فوراً ہی کارروائی کر کے اس آدمی کو منیجر کی پوسٹ سے ہٹا دیا۔ مکان اور جیپ وغیرہ بھی چھین لی گئی۔ ان کو ذلت کے ساتھ ادارہ سے باہر نکال دیا گیا۔

یہ وہی چیز ہے جس کو اخلاقی زبان میں قناعت اور حرص کہا جاتا ہے۔ اپنی واقعی حیثیت پر راضی رہنے کا نام قناعت ہے۔ اور اپنی حیثیت سے زیادہ چاہنے کا نام حرص۔ مذکورہ آدمی اگر قناعت کا طریقہ اختیار کرتا تو وہ نہ صرف کامیاب رہتا بلکہ مزید ترقی کرتا۔ مگر حرص کا طریقہ اختیار کر کے اس نے اپنے پائے ہوئے کو بھی کھو دیا ، اور آئندہ جو کچھ وہ پا سکتا تھا اس کو بھی۔

جب آپ اپنے حق کے بقدر چاہتے ہیں تو آپ وہ چیز چاہ رہے ہوتے ہیں جو واقعۃً آپ کی ہے ، جو از روئے انصاف آپ ہی کو ملنا چاہئے۔ مگر جب آپ اپنے واقعی حق سے زیادہ چاہیں تو گویا آپ ایسی چیز

چاہ رہے ہیں جو از روئے انصاف آپ کی چیز نہیں ہے، بلکہ دوسرے کی چیز ہے۔ پھر دوسرا شخص کیوں آپ کو اپنی چیز دینے پر راضی ہو جائے گا۔

جب بھی آدمی اپنے حق سے زیادہ چاہے تو فوراً اس کا ٹکراؤ دوسروں سے شروع ہو جاتا ہے۔ دوسرے لوگ اس کی راہ میں رکاوٹ بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اب کش مکش اور ضد اور مزاحمت وجود میں آتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے حریف بن جاتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی اصل سے زیادہ کی طلب میں اصل کو بھی کھو بیٹھتا ہے۔

اپنے حق سے زیادہ کی طلب کرتے ہی یہ ہوتا ہے کہ آدمی تضاد میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے حصہ کی چیز لینے کے لئے ایک دلیل دیتا ہے، اور دوسرے کے حصہ کی چیز پر قبضہ کرنے کے لئے دوسری دلیل استعمال کرتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے مقدمہ کو خود ہی کمزور کر لیتا ہے۔ وہ اپنی نفی آپ کر دیتا ہے۔ دو قسم کی دلیلوں سے وہ ثابت کرتا ہے کہ پہلی چیز اگر اس کی ہے تو دوسری چیز اس کی نہیں ہے، اور اگر دوسری چیز اس کی ہے تو پہلی چیز اس کی نہیں ہو سکتی۔

ایسے آدمی کے اوپر وہ مثال صادق آتی ہے کہ جو شخص دو خرگوشوں کے پیچھے دوڑے وہ ایک کو بھی پکڑ نہیں سکتا۔ اسی طرح جو شخص اپنے اصل حق کے ساتھ مزید کا طالب بنے، وہ اصل کو بھی کھو دے گا اور اسی کے ساتھ مزید کو بھی۔

ہر آدمی جو دنیا میں پیدا ہوتا ہے وہ خاص صلاحیت لے کر پیدا ہوتا ہے۔ ہر آدمی کو اس کے پیدا کرنے والے نے اسی لئے پیدا کیا ہے کہ وہ ایک کامیاب زندگی حاصل کرے۔ مگر ہر آدمی کی ایک حد ہے۔ اور ہر آدمی کو چاہئے کہ وہ اپنی حد کو جانے۔ جب آدمی اپنی حد کے اندر رہے تو دنیا کی تمام طاقتیں اس کو کامیاب بنانے کے لئے اس کی پشت پر آجاتی ہیں اور جب وہ اپنی حد سے آگے بڑھنے لگے تو ہر چیز اس کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ ایسے آدمی کے لئے ناکامی کے سوا کوئی اور انجام اس دنیا میں مقدر نہیں۔

آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے ۱۹ اپریل اور ۲۶ اپریل ۱۹۹۰ کو نشر کیا گیا۔

ایک سفر

بین اقوامی سفر آج کل ہوائی جہاز کی تیز رفتاری کے ساتھ کئے جاتے ہیں۔ مگر میں ذہنی طور پر ایک "سست رفتار" آدمی ہوں۔ اس بنا پر اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک سے زیادہ سفر قریب کی تاریخوں میں پیش آجائیں تو میں صرف ایک کو اختیار کر پاتا ہوں۔ اور بقیہ مجھ سے چھوٹ جاتا ہے۔

یہی واقعہ موجودہ سفر کے موقع پر پیش آیا۔ مئی ۱۹۹۰ کی ابتدائی تاریخوں کے لئے میرے پاس دو بیرونی دعوت نامے آئے تھے۔ دونوں کا ٹکٹ بھی آچکا تھا۔ مگر میں صرف ایک سفر کر سکا۔ دوسرا سفر مجھے چھوڑ دینا پڑا۔

پہلا سفر مجھے جنیوا (سوئٹزرلینڈ) کے لئے کرنا تھا۔ جنیوا میں سید جمال الدین افغانی کے مجلہ العروۃ الوثقی کے سلسلہ میں ایک تقریب تھی۔ یہ تقریب انٹرنیشنل ہوٹل (جنیوا) میں ۲ مئی ۱۹۹۰ کو ہوئی۔ سید جمال الدین افغانی نے پیرس سے العروۃ الوثقی کے نام سے ایک ماہانہ پرچہ عربی زبان میں نکالا تھا۔ وہ چھ مہینہ جاری رہ کر بند ہو گیا۔ اب ڈاکٹر عبد الحکیم طبیبی (افغانی) اسی نام سے جنیوا سے ایک پرچہ نکال رہے ہیں۔ یہ عربی اور انگریزی، دونوں زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ جنیوا میں اسی پرچہ (العروۃ الوثقی) کی دسویں سالگرہ (anniversary) کے سلسلہ میں ایک تقریب تھی۔

مجھے اس تقریب میں شریک ہونا تھا اور وہاں اپنے خیالات کا اظہار کرنا تھا۔ منتظمین کے رزرویشن کے مطابق، اس کے لئے میری روانگی ۳۰ اپریل کو مقرر تھی۔ دوسری کانفرنس ڈکار (سینیگال) میں ۷ - ۱۰ مئی ۱۹۹۰ کو تھی۔ اس میں شرکت کے لئے مجھے رزرویشن کے مطابق، ۴ مئی کو جنیوا سے روانہ ہونا تھا۔ مگر اپنی ذہنی سست رفتاری کی بنا پر میں بیک وقت دونوں سفروں کا پروگرام نہ بنا سکا۔ چنانچہ جنیوا کا پروگرام مجھ سے چھوٹ گیا۔ دہلی سے ۳۰ اپریل کو روانہ ہونے کے بجائے میں ۴ مئی کو روانہ ہوا۔ اور اسی دن جنیوا ہوتے ہوئے شام کو ڈکار پہنچا۔

اتنا لمبا سفر ایک دن میں طے ہونے کا سبب وقت کا فرق تھا۔ انڈیا اور سینیگال کے وقت میں

ساڑھے پانچ گھنٹہ کا فرق ہے۔ اس فرق کی بنا پر دن کو پورا کرنے کے لئے مجھے ساڑھے پانچ گھنٹے مزید مل گئے۔

ایک ملک اور دوسرے ملک میں وقت کا فرق زمین کی محوری گردش کی بنا پر ہے۔ آدمی زمین کے "وقت" میں فرق نہیں کرسکتا، اس لئے اس نے اپنی گھڑی کے وقت میں فرق کرلیا۔ حقیقت سے اسی مطابقت کا نام ایڈجسٹمنٹ ہے۔ اور اسی ایڈجسٹمنٹ میں تمام کامیابیوں کا راز چھپا ہوا ہے۔ جو لوگ حقیقتِ واقعہ سے مطابقت پر راضی نہ ہوں، ان کو اس دنیا میں صرف اپنی بربادی پر راضی ہونا پڑتا ہے، خواہ وہ اس کو پسند کریں یا ناپسند۔

اس سفر کا پہلا مرحلہ ۲۴ اپریل ۱۹۹۰ کو پیش آیا۔ کانفرنس کے منتظمین کی طرف سے جو کاغذات آئے تھے، اس میں درج تھا کہ روانگی سے پہلے زرد بخار (yellow fever) کا انجکشن لگوالیں۔ اس سلسلہ میں ۲۴ اپریل کو نئی دہلی میونسپل کمیٹی کے دفتر میں جانا ہوا۔ یہاں ہفتہ میں دو بار (بدھ، جمعہ) کو باہر جانے والے مسافروں کے لئے ٹیکہ (vaccination) کا انتظام ہے۔ وہاں پہنچا تو پورا ہال مردوں اور عورتوں سے بھرا ہوا تھا۔ یہ تمام لوگ باہر جانے کے لئے ٹیکہ لگوانے آئے تھے۔ میں مسٹر شاستری کے پاس بیٹھ گیا جو رجسٹر میں ہر ایک کے نام کا اندراج کر رہے تھے۔ نام سے اندازہ ہوا کہ آنے والوں میں چند عیسائی اور بیشتر ہندو تھے۔ میرے سوا وہاں کوئی بھی مسلمان نظر نہ آیا۔

اس کا مطلب واضح طور پر یہ تھا کہ "انٹرنیشنل ٹریول" میں مسلمانوں کا حصہ بہت کم ہے۔ ہمارے نام نہاد مسلم رہنما روزانہ کوئی نہ کوئی "تاریخ ساز" اجتماع کرتے رہتے ہیں۔ آپ ان میں شرکت کریں تو آپ کو نظم ونثر میں اس قسم کی باتیں سننے کو ملیں گی:

پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی　　ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے

مگر اصل صورت حال اس کے برعکس ہے۔ لفظی پرواز میں مسلمان سب سے آگے ہیں، اور حقیقی پرواز میں سب سے پیچھے۔

نئی دہلی میونسپل کمیٹی کے مذکورہ دفتر جانے سے پہلے میں ایک عربی جریدہ پڑھ رہا تھا۔ اس میں ایک مضمون تھا جس کا عنوان تھا: مقیاس التقدم والتخلف (آگے اور پیچھے ہونے کا معیار) اس مضمون میں ان لوگوں کو برا کہا گیا تھا جو "مستشرقین" کی تقلید میں مسلمانوں کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ وہ ایک پچھڑی

ہوئی قوم ہیں۔ یہ لوگ مسلمانوں کو مادی معیار سے جانچتے ہیں۔ یہ معیار بجائے خود غلط ہے۔ مسلمان کی نظر میں اصل معیار ایمان ہے۔ اور مسلمانوں کو چوں کہ ایمان کی دولت حاصل ہے، اس لئے وہ سب سے آگے ہیں۔ اور دوسری تمام قومیں ان سے پیچھے ہیں۔ کیوں کہ وہ کفر و الحاد میں مبتلا ہیں۔ اور کفر و الحاد اور مادیت ہی دراصل وہ چیز ہے جو کہ پچھڑا پن ہے (وان الكفر والالحاد والماديات هو التخلف)

یہ تقابل درست نہیں۔ تقدم سے مراد مادی تقدم بھی ہو سکتا ہے اور ایمانی تقدم بھی۔ اگر مسلمانوں کو مادی تقدم کے اعتبار سے جانچنا ہو تو انھیں مغربی قوموں کے معیار سے جانچا جائے گا۔ اور اگر مسلمانوں کو ایمانی تقدم کے اعتبار سے جانچنا ہو تو ان کو اصحاب رسول کے معیار سے جانچا جائے گا۔ کیوں کہ اس دوسرے معاملہ میں "قدوۃ" وہی ہیں۔

مضمون نگار اگر چاہتے ہیں کہ تقدم کے لئے ایمان کو معیار بنائیں تو ان کو چاہئے کہ موجودہ مسلمانوں کے ایمان کا تقابل اصحاب رسول کے ایمان سے کریں اور موجودہ مسلمانوں کی مادیات کا تقابل موجودہ ملحدین کی مادیات سے۔ یہ ایک غیر منطقی تقابل ہے کہ تقدم کا معیار ایمان کو قرار دیا جائے اور پھر ایمان کو ملحدین کے معیار سے جانچا جائے۔ اس قسم کے مضامین بلاشبہ مضر ہیں۔ کیوں کہ وہ مسلمانوں میں جھوٹا فخر پیدا کر کے انھیں بے عمل اور بے تدبیر بنا رہے ہیں۔

نئی دہلی میں سینیگال کی ایمبیسی موجود ہے۔ جو صاحب سینیگال ایمبیسی میں میرا ویزا لینے کے لئے گئے تھے، انھوں نے بتایا کہ ویزا افسر نے پاسپورٹ میں میری تصویر دیکھی تو کہا کہ میں ان کو جانتا ہوں۔ ہم کو خوشی ہے کہ وہ ہمارے ملک میں جا رہے ہیں۔

ویزا افسر کے اس طرح "پہچاننے" کا سبب یہ تھا کہ ٹائمس آف انڈیا (۱۰ دسمبر ۱۹۸۹) میں میرا انٹرویو چھپا تھا۔ اس میں انٹرویورنے میری تصویر بھی چھاپ دی تھی۔ مذکورہ افسر نے کہا کہ میں نے اس انٹرویو کو پڑھا تھا اور اس میں ان کی تصویر دیکھی تھی۔ یہ تصویر اب بھی میرے پاس محفوظ ہے۔ موجودہ زمانہ کے نئے امکانات میں سے ایک امکان یہ ہے کہ ایک شخص کسی آدمی کو براہ راست نہ دیکھے، اس کے باوجود وہ اس کو اس کی صورت سے پہچانتا ہو۔

اس زمانہ میں تصویری صحافت نے انسان کے اوپر جو نئے مواقع کھولے ہیں، ان کی یہ ایک چھوٹی سی مثال ہے۔ ہندستان کے علماء تصویر کو ناجائز بتاتے ہیں، مگر یہی علماء عرب شخصیتوں کا اپنے اداروں

میں استقبال کر رہے ہیں، جب کہ یہ عرب لوگ تصویر کو عین جائز سمجھتے ہیں۔

ہندستان کے دو عالموں کے درمیان اگر اختلاف ہو تو دونوں کے درمیان نزاع قائم ہو جاتی ہے۔ مگر یہی اختلاف ہندستانی عالم اور عرب عالم کے درمیان ہو تو ہندستانی عالم اس کو خندہ پیشانی کے ساتھ گوارا کر لیتا ہے۔ اس فرق کا سبب کیا ہے، یہ ایک نازک معاملہ ہے۔ مگر اس سے پردہ اٹھانا شاید خدا کے سوا کسی اور کے اختیار میں نہیں۔

دہلی سے لفتھانسا کی فلائٹ ۷۶۱ کے ذریعہ رات کو ۳ بجے (۴ مئی ۱۹۹۰) روانگی ہوئی۔ تقریباً آٹھ گھنٹہ کی مسلسل پرواز کے بعد فرینکفرٹ (جرمنی) پہنچا۔ پورا سفر نہایت ہموار گزرا۔ سفر کا وقت بڑا عجیب تھا۔ یعنی نصف شب کے وقت رات کو ساڑھے گیارہ بجے گھر سے ایرپورٹ کے لئے روانہ ہونا تھا۔ ایک صاحب نے مشورہ دیا کہ رات کی نیند خراب ہو جائے گی۔ اس لئے دن کو سولیں۔ مگر میں ایسا نہ کر سکا۔

یہ مشورہ درست نہ تھا۔ میں دہلی میں برابر اپنا کام کرتا رہا۔ اس کی وجہ سے کچھ زیادہ تکان آگئی۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ جہاز کے اندر پہنچا تو جلد ہی نیند آگئی۔ دیر تک گہری نیند سوتا رہا۔ اس طرح نیند بھی ایک اور شکل میں پوری ہو گئی۔ وقت بھی استعمال ہو گیا اور آٹھ گھنٹہ کا لمبا سفر آسانی کے ساتھ گزر گیا۔ بہت سے مشورے بظاہر ٹھیک نظر آتے ہیں مگر حقیقۃً وہ بے ٹھیک ہوتے ہیں۔

فرینکفرٹ ایرپورٹ پر میں نے ۴ مئی کو فجر کی نماز پڑھی۔ ایک جرمن خاتون میری نماز کو غور سے دیکھتی رہی۔ جب میں فارغ ہو کر اٹھا تو اس نے معذرت کے ساتھ پوچھا "کیا آپ یوگا کا عمل کر رہے تھے"۔ میں نے کہا نہیں، میں صلاۃ کا عمل کر رہا تھا۔ وہ یوگا کو جانتی تھی، مگر وہ صلاۃ کو نہیں جانتی تھی۔ اس نے پوچھا کہ صلاۃ کیا چیز ہے۔ میں نے کہا، کیا آپ خدا کو مانتی ہیں۔ اس نے کہا ہاں۔ میں نے کہا کیا آپ مانتی ہیں کہ خدا ہمارا خالق اور رب ہے۔ اس نے کہا ہاں۔ میں نے کہا پھر نماز اسی خالق اور مالک کی عظمت اور اس کے احسان کا اعتراف ہے۔

خدا صبح لاتا ہے تو ہم جھک کر کہتے ہیں کہ خدایا تیرا شکر ہے کہ تو نے میرے لئے دن کو روشن کیا تاکہ میں کام کروں۔ خدا شام لاتا ہے تو ہم جھک کر کہتے ہیں کہ خدایا تیرا شکر ہے کہ تو میرے لئے رات لایا تاکہ میں آرام کروں۔ اس طرح ہم رات اور دن میں پانچ بار خدا کی عظمت اور اس کے انعامات کا

اعتراف کرتے ہیں۔ جرمن لیڈی بہت غور سے میری بات کو سنتی رہی۔ اس کے بعد تھینک یو، تھینک یو کہتی ہوئی چلی گئی۔

فرینکفرٹ سے جنیوا کے لئے لفتھانسا کی فلائٹ ۸۴۶ اکے ذریعہ روانگی ہوئی۔ گیٹ ۳۲ بی کی تلاش میں نکلا تو ایک بورڈ پر لکھا ہوا نظر آیا کہ اپنی پرواز کے لئے اپنی مدد آپ کریں :

For your flight — Please help yourself.

میں نے دیکھنا شروع کیا تو مکمل نشانات اتنی زیادہ مقدار میں جگہ جگہ لگے ہوئے تھے کہ وسیع ایرپورٹ پر اپنے مطلوبہ گیٹ پر پہنچنا بالکل آسان تھا۔ سینکڑوں آدمی انھیں نشانات کی مدد سے اپنے مطلوبہ مقام پر چلے جا رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ اس سے بہت زیادہ بڑے پیمانے پر خدا نے اپنی معرفت کے نشانات کائنات میں جگہ جگہ نصب کر رکھے ہیں۔ مگر کوئی شخص ان سے رہنمائی حاصل نہیں کرتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ "ایرپورٹ" کے نشانات کے بارہ میں لوگ سنجیدہ ہیں۔ مگر خدا کے نشانات کے بارہ میں لوگ سنجیدہ نہیں۔ اور نشانات سے رہنمائی حاصل کرنے کے لئے آدمی کا سنجیدہ ہونا انتہائی ضروری ہے۔

فرینکفرٹ ایرپورٹ پر ایک جرمن پروفیسر سے ملاقات ہوئی۔ وہ پروفیسر کارل ٹرال (Carl Troll) کے شاگرد تھے۔ انھوں نے بتایا کہ کارل ٹرال یونیورسٹی آف بون میں جغرافیہ کے پروفیسر تھے۔ وہ ۱۸۹۹ میں پیدا ہوئے اور ۱۹۷۵ میں وفات پائی۔ وہ اپنے فن میں ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ چنانچہ ان کو جغرافیہ دانوں کی عالمی یونین (International Union of Geographers) کا پریسیڈنٹ بنایا گیا۔

انھوں نے بتایا کہ ۱۹۶۴ میں وکٹوریہ البرٹ ہال (لندن) میں پروفیسر کارل ٹرال کی اسپیچ تھی۔ اس میں مختلف ملکوں کے ممتاز سائنس داں جمع تھے۔ اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے پروفیسر ٹرال نے کہا کہ سائنس داں کی حیثیت سے ان کی زندگی کا بنیادی تجربہ یہ ہے کہ وہ خالق کے زیادہ سے زیادہ احسان مند ہوتے چلے گئے اور تخلیقی عمل میں خدا کی عظمت کو دیکھ کر وہ حیران کن احساس سے بھر گئے :

The basic experience of his life as a scientist has been that he became more and more grateful to the Creator and full of wonders at God's greatness in His works of creation.

انھوں نے بتایا کہ پروفیسر کارل ٹرال کے الفاظ پر حاضرین میں سے کسی نے اعتراض نہیں کیا۔ بلکہ اکثر سائنس داں اٹھ کر ان کے پاس آئے اور اظہار مسرت میں ان سے ہاتھ ملایا۔

یہ احساس ان تمام اہل علم کا ہے کہ جو نیچر کا مطالعہ کرتے ہیں۔ کوئی جرأت مند اس کا اعلان کر دیتا ہے۔ اور کچھ لوگ اس کو اپنے دل میں لئے ہوئے اس دنیا سے چلے جاتے ہیں۔

لفتھانساکی فلائٹ میگزین (Bordbuch) کے شمارہ مئی ۱۹۹۰ کے ایک مضمون میں بتایا گیا تھا کہ دوسری عالمی جنگ کے بعد ایسٹ جرمنی اور ویسٹ جرمنی میں ہوائی پرواز پر پابندیاں عائد ہو گئی تھیں۔ دونوں کے بیچ ایک درمیانی علاقہ قائم کر دیا گیا تھا جس کو مختصر طور پر اے ڈی آئی زڈ کہا جاتا تھا:

Air Defence Identification Zone (ADIZ)

مگر آج یہ حد بندی ٹوٹ گئی ہے۔ اب دونوں جرمن ریاستوں کے درمیان صرف لفتھانساکی ہفتہ میں ۲۸ پروازیں قائم ہو چکی ہیں۔

آج کی دنیا میں لوگ جغرافی حدود کو توڑ رہے ہیں تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ اپنے تعلقات کو بڑھائیں مگر اسی دنیا میں مسلمان ہر جگہ اپنی جغرافی حدود کو گھٹانا چاہتے ہیں تاکہ اپنے چھوٹے چھوٹے گھروندے بنا سکیں۔

اس کو وہ بطور خود "اسلامستان" کہتے ہیں۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں میں اس ظاہرہ کا ظہور دراصل احساس شکست کی علامت ہے۔ مسلمان بڑھتے ہوئے کامپیٹیشن کی اس دنیا میں دوسروں سے مقابلہ کر کے ان کے درمیان زندہ رہنے کی طاقت اپنے اندر نہیں پاتے۔ اس لئے وہ چاہتے کہ اپنی حدیں کھینچ کر اس کے اندر اپنے لئے زندہ رہنے کا موقع تلاش کریں۔ موجودہ زمانہ کی وہ تحریکیں جن کو مسلمان بطور خود آزادی کی تحریکیں کہتے ہیں، وہ صرف ان کی شکست خوردہ نفسیات کے مظاہر ہیں۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

موجودہ زمانہ میں ہوٹلوں اور بینکوں کی عالمی تنظیم نے اس کو ممکن بنا دیا ہے کہ آدمی دنیا کے کسی بھی حصہ میں اپنے لئے ہر قسم کی آسودگی اور مواقع اطمینان بخش طور پر پا سکے۔ میگزین میں "اکسپریس کارڈ" کا اشتہار ان لفظوں میں ایک پورے صفحہ پر چھپا ہوا تھا:

Whatever your destination, all you need to get into 880 of Europe's best hotels is the American Express Card.

یعنی آپ کی جو بھی منزل ہو، یورپ کے ۸۸۰ بہترین ہوٹلوں میں سے کسی ہوٹل میں جگہ حاصل کرنے کے لئے آپ کو صرف ایک چیز کی ضرورت ہے اور وہ امریکی بینک کا امریکن اکسپرس کارڈ ہے۔

اس کو میں نے پڑھا تو قرآن کی وہ آیت یاد آگئی جس میں اہل جنت کی زبان سے جنت کے بارہ میں کہلایا گیا ہے کہ شکر ہے اس اللہ کا جس نے ہمارے ساتھ اپنا وعدہ پورا کیا اور ہم کو اس زمین کا وارث بنا دیا۔ ہم جنت میں جہاں چاہیں مقام کریں۔ (الزمر ۷۴)

جہاز میں سوئٹزرلینڈ کے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص سے ملاقات ہوئی۔ ان کی مادری زبان کچھ اور تھی، مگر انگریزی زبان روانی کے ساتھ بول رہے تھے۔ گفتگو کے دوران انڈیا کا ذکر آیا۔ انھوں نے کہا کہ انڈیا اتنا بڑا ملک ہے کہ کسی ایک حکومتی اقتدار کے تحت اس کا انتظام نہیں کیا جا سکتا:

India is too big to be managed.

ان کا خیال تھا کہ انڈیا کا وہی انجام ہوگا جو سوویت یونین کا ہو رہا ہے۔ وہ disintegrate ہو جائے گا۔ میں نے کہا کہ مگر ہمارے سامنے دوسری مثال یو ایس اے (امریکہ) کی ہے۔ وہ انڈیا سے بھی زیادہ بڑا ہے۔ اس کے باوجود اس کا انتظام چل رہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ امریکہ کے وسائل بہت زیادہ ہیں۔ وہ ایک امیر ملک (rich country) ہے۔ اس لئے وہاں وہ عوامی بے چینی نہیں جو کہ انڈیا میں بہت بڑے پیمانہ پر پائی جاتی ہے۔

میں نے کہا کہ سوویت یونین کو جو چیز منتشر کر رہی ہے وہ اس کا سائز نہیں ہے، بلکہ اس کا جبر ہے۔ اسی طرح امریکہ کو جو چیز کامیاب بنائے ہوئے ہے وہ اس کی دولت نہیں ہے بلکہ آزادی ہے۔ انڈیا میں بھی آزادی ہے۔ مگر انڈیا میں اسی کے ساتھ جہالت ہے۔ انڈیا اگر تعلیم کے معاملہ میں امریکہ کے برابر ہو جائے تو اس کی سالمیت کو کوئی خطرہ نہیں رہے گا۔ میں نے کہا کہ ۱۹۴۷ کے بعد انڈیا میں جو حکومتیں آئیں، بدقسمتی سے ان میں سے کسی حکومت نے بھی تعلیم کو وہ اہمیت نہ دی جو اس کو دینا چاہئے۔ چنانچہ آج بھی انڈیا میں ۸۰ فی صد سے زیادہ افراد ناخواندہ یا نیم خواندہ ہیں۔ یہی انڈیا کا اصل مسئلہ ہے۔

یہ جہاز (b-747) ساخت کا تھا۔ ایک کارڈ پر دوران پرواز حفاظتی تدابیر درج تھیں۔ اس سے پہلے پندرہ زبان میں لکھا ہوا تھا: آپ کی حفاظت کے لئے (for your safety) سب سے آخر میں پندرہویں نمبر پر عربی میں "من اجل سلامتك" درج تھا۔ عربی فقرہ کا آخر میں اندراج کسی تعصب کی بنا پر نہ تھا۔ اس قسم کی تجارتی کمپنیاں صرف یہ دیکھتی ہیں کہ ان کے مسافروں میں کتنے آدمی کس زبان والے ہیں۔ اسی کے لحاظ سے وہ ترتیب مقرر کرتی ہیں۔

یہ تعصب کی بات نہیں بلکہ حقیقت کی بات ہے کہ مسلمان انٹرنیشنل اسفار میں "پندرہویں نمبر" پر ہیں۔ مسلم مسافرین میں زیادہ تر افراد وہ ہوتے ہیں جو کسی نہ کسی نوعیت کا مذہبی سفر کر رہے ہوتے ہیں۔ جب کہ موجودہ زمانہ میں زیادہ تر سفر سیاحت، تجارت، سیاست اور حکومتی تعلقات کے تحت ہوتا ہے اور اس قسم کے سفروں میں مسلمانوں کا بہت کم حصہ ہے۔

میرے قریب کناڈا کے ایک سیاح (Dr Thomas Raye) تھے۔ وہ ہندستان سے آرہے تھے۔ میں نے پوچھا کہ کناڈا میں اور انڈیا میں کیا فرق ہے۔ انھوں نے مسکرا کر کہا کناڈا میں طرح طرح کی مادی ترقیاں ہیں اور انڈیا میں طرح طرح کے انسان۔ انھوں نے اپنی جیب سے دو درجن رنگین تصویریں نکالیں جو انھوں نے انڈیا کے قیام کے دوران کھینچی تھیں۔ اس میں عجیب عجیب صورتیں تھیں۔ کسی میں کوئی بندر نچا رہا ہے۔ کہیں کوئی نعرہ لگا رہا ہے، کہیں کوئی بھیک مانگ رہا ہے۔ کہیں کوئی برقع پوش عورت ہے، کہیں کوئی رکشا کھینچ رہا ہے۔ وغیرہ۔

ترقی یافتہ ملکوں کی نظر میں انڈیا ایک بچھڑا ہوا ملک ہے۔ انڈیا کے لوگ اس کو مغرب کا تعصب کہتے ہیں۔ مگر یہ صحیح نہیں۔ یہ درست ہے کہ انڈیا میں ترقیاں ہوئی ہیں۔ مگر یہ ترقیاں اس درجہ سے بہت کم ہیں جہاں پہنچ کر آدمی کا اعتراف کیا جاتا ہے۔ اعتراف کا عملی اصول یہ ہے کہ آپ سو درجہ ہوں تو لوگوں کو آپ دس درجہ دکھائی دیں گے۔ اس لئے دنیا نے اگر آپ کا اعتراف نہ کیا ہو تو دوسروں کی شکایت کرنے کے بجائے اپنے آپ کو مزید اٹھائیے یہاں تک کہ آپ کی بلندی اس اعلیٰ درجہ تک پہنچ جائے کہ کوئی شخص اس کو دیکھے بغیر نہ رہ سکے۔

چالیس سال پہلے جاپان کی تصویر دنیا کی نظر میں نہایت حقیر تھی۔ حتی کہ ابتدائی ترقی کے بعد بھی کوئی اس کو ماننے کے لئے تیار نہ تھا۔ مگر آج جب کہ جاپان کی ترقی کا پیالہ بھر کر ابل پڑا تو اب ہر آدمی اس

کا اعتراف کر رہا ہے۔ میری سیٹ کے پاس تھیلے میں ایک خوبصورت سا پمفلٹ تھا۔ اس پر لکھا ہوا تھا:
آسمان میں خریداری (shopping in the sky) اس پمفلٹ میں بتایا گیا تھا کہ دوران پرواز آپ جہاز کی "مارکٹ" سے کیا کیا چیز خرید سکتے ہیں۔ میں نے مذکورہ جملہ پڑھا تو معاً مجھے خیال آیا کہ دوسرے مسافروں کا کیس اگر "شاپنگ ان دی اسکائی" ہے تو میرا کیس "تھنکنگ ان دی اسکائی" کہا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ میرا ذہن ہمیشہ سوچنے میں لگا رہتا ہے۔

پھر خیال آیا کہ دنیا کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ دنیا میں بیشتر لوگ "شاپنگ" کو اصل کارنامہ سمجھتے ہیں۔ یعنی دنیا کی مارکیٹ میں جو چیزیں مل رہی ہیں، اس کا زیادہ سے زیادہ ذخیرہ اپنے لئے سمیٹ لیں۔ کچھ لوگ ظاہری مادی سامان خریدتے ہیں اور کچھ لوگ اخباری شہرت، عوامی مقبولیت، اسٹیج کی لیڈری کو سب سے بڑی چیز سمجھ کر اس کو حاصل کرنے میں کوشاں رہتے ہیں۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ سب سے بڑی چیز جو اس دنیا سے حاصل کی جائے وہ سوچنا ہے جس کو قرآن میں ذکر و فکر (آل عمران) کہا گیا ہے۔ ذکر و فکر کسی قسم کے الفاظ کی تکرار نہیں ہے۔ یہ دراصل ذہنی تخلیق کا ایک عمل ہے۔ آدمی مرئی حقیقتوں کو غیر مرئی حقیقتوں میں تبدیل کرتا ہے۔ وہ دنیا کے مادی کارخانہ سے روحانی پیداوار نکالتا ہے۔ وہ عالم ظاہر سے ایک عالم باطن کی تعمیر کرتا ہے۔ اسی کا نام ذکر و فکر ہے۔

فرینکفرٹ سے جنیوا جاتے ہوئے جہاز میں مختلف یورپی اخبارات تھے۔ میں نے ایک اخبار (USA Today) لیا۔ اس کے صفحہ ۱۲ پر ایک رپورٹ تھی جس کا عنوان تھا: نیا جنگی میدان (The new war zone) اس رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ جب سے امریکہ اور سوویت روس نے اپنی بندوقیں رکھ دی ہیں، اقتصادی طاقت ایک طاقت ور ہتھیار بن گئی ہے۔ اور اس نے چھوٹی طاقتوں مثلاً جاپان اور جرمنی کے لئے اس بات کا دروازہ کھول دیا ہے کہ وہ عالمی اہمیت حاصل کرنے کی طرف آگے بڑھ سکیں:

Since the USA and Soviet Union have put down their guns, economic strength has become a powerful weapon. And that has opened the door for smaller powers—such as Japan and West Germany—to move into positions of global prominence.

ان سطروں کو پڑھتے ہوئے مجھے معاہدہ حدیبیہ کی حکمت یاد آگئی۔ معاہدہ حدیبیہ میں یہی ہوا تھا کہ قریش دس سال تک کے لئے تلوار میان میں رکھنے پر راضی ہوگئے تھے۔ چنانچہ جیسے ہی ایسا ہوا، اسلام نے دعوتی طاقت کی حیثیت سے ابھرنا شروع کردیا۔ رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ امریکہ میں آج کل ایک لطیفہ (joke) مشہور ہو رہا ہے کہ سرد جنگ ختم ہوگئی اور جاپان جیت گیا:

The Cold War is over — and Japan won.

فرینکفرٹ سے جنیوا کی پرواز تقریباً ایک گھنٹہ کی تھی۔ جہاز نے کافی نیچے نیچے پرواز کیا۔ چنانچہ اس سفر کے دوران جرمنی اور سوئٹزر لینڈ کے دیہات بہت صاف نظر آتے رہے۔ دیہات کے مکانات انتہائی منظم تھے۔ صاف ستھرا ماحول، ہر طرف سڑکیں نظر آرہی تھیں۔ باغوں اور کھیتوں کے ہرے بھرے قطعات اتنے خوب صورت تھے جیسے وہ قدرتی آرٹ کے نمونے ہوں۔ ترقی یافتہ ملکوں میں دیہات کی زندگی نہایت خوش گوار ہوتی ہے۔ یہاں وہ ہی تمام سہولتیں موجود ہوتی ہیں جو شہروں میں ہوتی ہیں۔ مزید یہ کہ وہاں قدرت کا ماحول ہوتا ہے جو شہروں میں نہیں پایا جاتا۔

اخبار میں گھوڑ دوڑ (Derby) کا ایک صفحہ تھا۔ ایک تصویر میں ایک شخص گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھا ہوا اس کو شاندار طور پر دوڑا رہا تھا۔ دوسری طرف میری نظر جہاز کے مسافروں پر گئی جو اپنی اپنی سیٹ پر بیٹھے ہوئے تھے اور جہاز ان کو اڑاتا ہوا ان کو ان کی منزل کی طرف لے جا رہا تھا۔ یہ دیکھ کر بے اختیار مجھے قرآن کی وہ آیت یاد آگئی جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہم نے آدم کی اولاد کو عزت دی اور ہم نے ان کو خشکی اور تری میں سوار کیا۔ (بنی اسرائیل ۷۰)

یہ انتہائی عجیب بات ہے کہ گھوڑے کو انسان کے بیٹھنے کے لئے نہایت موزوں بنایا گیا۔ اور پھر اس کے اندر یہ صفت رکھ دی گئی کہ وہ انسان کو اپنی پیٹھ پر لے کر دوڑے۔ اسی طرح مادہ کے اندر اللہ تعالیٰ نے یہ صفت رکھ دی کہ وہ ریل اور کار اور ہوائی جہاز کی صورت میں انسان کو تیزی کے ساتھ اِدھر سے اُدھر لے جائے۔ انسان کی یہ تکریم وعزت بلاشبہہ انسان کے اوپر اللہ کا عظیم احسان ہے۔ مگر شاید ہی آج کی دنیا میں ایسے کچھ آدمی ہوں جن کا یہ حال ہو کہ خدائی انعامات کے احساس سے ان کے جسم پر تھرتھری پیدا ہو جائے اور ان کا پورا وجود خدا کے آگے ڈھ پڑے۔

۴ مئی کی سہ پہر کو سوئس ایر کی فلائٹ ۲۴۲ کے ذریعہ جنیوا سے دکار کے لئے روانگی ہوئی۔ میری سیٹ کھڑکی سے ملی ہوئی تھی۔ باہر کی طرف دیکھا تو جہاز کا "پر" لمبا پھیلا ہوا تھا۔ پر کے اوپر انگریزی میں یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے کہ اس کے آگے نہ چلیں:

Do not walk outside this area.

ہوائی جہاز جب ایرپورٹ پر کھڑا ہوتا ہے تو کارکن حضرات اس کو چیک کرتے ہیں۔ اس وقت کوئی شخص چلتا ہوا پر کے اوپر پہنچ سکتا ہے۔ اس لئے اس کو پر کے اوپر چلنے سے منع کر دیا گیا۔ کیونکہ ہوائی جہاز کا پر اس کا کمزور حصہ ہے۔ وہ انسانی بوجھ کا تحمل نہیں کر سکتا۔

پر کے اوپر مذکورہ الفاظ پڑھتے ہوئے مجھے وہ حدیث یاد آگئی جس میں کہا گیا ہے کہ اللہ کی کچھ حدیں ہیں تم ان حدوں سے تجاوز نہ کرو۔ "حد" کا معاملہ دنیا اور آخرت دونوں قسم کے معاملات میں انتہائی اہمیت رکھتا ہے۔ دونوں عالموں میں وہی لوگ کامیاب رہیں گے جو حد کو جانیں۔ مثلاً کسی سے آپ کو اختلاف ہو تو علمی تردید کی حد تک آپ جا سکتے ہیں۔ اس کے آگے الزام تراشی اور کردارکشی اور سب وشتم کے لئے زبان وقلم کو استعمال کرنے کی کسی کو اجازت نہیں۔ اسی طرح عمل کے معاملہ میں جائز حدود میں سرگرم ہونے کی ہر ایک کو اجازت ہے۔ مگر جائز حدود کے باہر کسی کو اجازت نہیں۔

دکار ایرپورٹ سے شہر جاتے ہوئے ہماری گاڑی جہاں کہیں لال بتی پر کھڑی ہوتی، فوراً ہی "سیاہ فام" چھوٹے اور بڑے افراد گاڑی کے گرد جمع ہو جاتے۔ یہ عین وہی منظر ہے جو دہلی کی سڑکوں پر نظر آتا ہے۔ مگر دہلی میں جو لوگ اس طرح گاڑی کو گھیرتے ہیں وہ زیادہ تر بھیک مانگنے والے ہوتے ہیں۔ یہاں اس کے برعکس منظر تھا۔ یہ لوگ اپنے ہاتھوں میں مختلف قسم کے سامان لئے ہوئے ہوتے اور ان کو فروخت کرتے تھے۔ یورپ کے شہروں میں آپ جائیں تو وہاں آپ کو دونوں میں سے کوئی منظر بھی دکھائی نہیں دے گا۔

دکار میں میرا قیام ہوٹل نووٹل (Novotel) میں کمرہ نمبر ۲۳۸ میں تھا۔ پہلی نماز جو میں نے اس ہوٹل میں پڑھی وہ مغرب کی نماز تھی۔ کسی نئے مقام پر نماز پڑھنا ہمیشہ میرے لئے ایک عجیب تجربہ ہوتا ہے۔ ایسے مواقع پر اکثر یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ شاید میں پہلا شخص ہوں جو اس مقام

پر رب العالمین کے آگے سجدہ ریز ہو رہا ہے۔

یہ ہوٹل کسی بیرونی کمپنی نے بنایا ہے۔ وہ سمندر کے عین کنارہ ہے۔ پورا ماحول نہایت خوش منظر ہے۔ ہوٹل کے طعام خانہ میں فرانسیسی گانے کا ریکارڈ دھیمی آواز سے بجتا رہتا تھا۔ یہ غالباً یورپی سیاحوں کی رعایت سے ہے، جن میں اکثریت فرانسیسیوں کی ہوتی ہے۔

اس مجبورانہ سماعت کے دوران سمجھ میں آیا کہ کیا وجہ ہے کہ اردو نہ جاننے والے لوگ بھی اردو غزل سننا پسند کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فرانسیسی یا انگریزی گانے میں سننے والوں کے لئے وہ کیفیت نہیں جو غزل کے نغمہ میں پائی جاتی ہے۔

ڈکار (Dakar) سینیگال کی راجدھانی ہے۔ وہ افریقہ کی مغربی سرحد پر واقع ہے۔ اپنی جغرافی اہمیت کی بنا پر ڈکار افریقہ کے اہم شہروں میں سے ایک سمجھا جاتا ہے۔ ۱۹۰۴ سے ۱۹۵۹ تک وہ مغربی افریقہ میں فرانس کا سیاسی مرکز تھا۔ شہر کی آبادی ایک ملین سے کچھ زیادہ ہے۔ سینیگال کی آبادی میں ۹۵ فی صد سے زیادہ مسلمان ہیں۔

ڈکار میں ڈچ ۱۶۱۷ میں آگئے تھے۔ فرانسیسیوں نے ۱۶۷۷ میں اس پر قبضہ کیا۔ ایک زمانہ میں ڈکار غلاموں کی تجارت کا مرکز سمجھا جاتا تھا۔ فرانسیسیوں نے ۱۸۶۶ میں یہاں اسٹیم شپ کارخانہ قائم کیا۔ ۱۸۸۵ میں یہاں پہلی ریلوے لائن بچھائی گئی۔ یہ ریلوے لائن سینٹ لوئی اور ڈکار کے درمیان تھی۔ ۱۹۱۴ میں ڈکار ایک ترقی یافتہ شہر بن چکا تھا۔

دوسری عالمی جنگ کے زمانہ میں اور اس کے بعد یہاں صنعت کو کافی ترقی ہوئی۔ فرانسیسی اقتدار کے تحت پورا مغربی افریقہ اس کو وسیع مارکٹ کے طور پر حاصل تھا۔ ۱۹۵۹ اور ۱۹۶۱ کے درمیان مغربی افریقہ کی فرانسیسی حکومت ٹوٹ گئی۔ اس کے بعد یہ علاقہ آٹھ آزاد ریاستوں میں بٹ گیا۔ اب اس کا مارکٹ کا میدان بہت کم ہوگیا ہے۔ (5/437)

ڈکار سے فرانسیسی قبضہ ختم ہو چکا ہے۔ مگر فرانسیسی تہذیب کے آثار اب بھی نمایاں طور پر باقی ہیں۔ یہاں کی سرکاری زبان فرانسیسی ہے۔ تاہم عربی جاننے والے لوگ بھی کافی تعداد میں موجود ہیں۔

سینیگال کا رقبہ ۷۵۷۵۰ مربع میل ہے۔ اور آبادی تقریباً ۳۷۵۵۰۰۰ لوگوں پر مشتمل

ہے۔ وہ ۱۹۶۰ میں آزاد ہوا۔ اس سے پہلے وہ فرانس کے قبضہ میں تھا۔ اس کے اثر سے اب بھی سینیگال کی سرکاری زبان فرانسیسی ہے۔

سینیگال دراصل یہاں کے سرحدی دریا کا نام ہے جو ۱۰۱۵ میل لمبا ہے۔ اہل یورپ تک اس کا تعارف سونے کا دریا (River of Gold) کی حیثیت سے پہنچا۔ ۱۶ویں صدی سے لیکر ۲۰ویں صدی تک یہی دریا فرانس کے نوآبادیاتی اثرات کو سینیگال تک پہنچانے کا ذریعہ بنا رہا۔

سینیگال مغربی افریقہ کا ساحلی ملک ہے۔ عربوں نے اس کو ابتدائی دور میں کامیابی کے ساتھ فتح کیا اور اس علاقہ کی تجارت پر قابض ہو گئے۔ ایک مورخ نے لکھا ہے کہ نویں صدی اور چودھویں صدی عیسوی کے درمیان عرب دنیا میں جغرافیہ دانی اور تاریخ دانی کو کافی فروغ ہوا۔ اس سے عربوں کو اس علاقہ کے بارہ میں مفصل معلومات حاصل ہوئیں جس کو وہ بلاد السودان کہتے تھے:

> The lively school of geographers and historians that flourished in the Arab world from about the 9th to the 14th century thus secured access to growing amounts of information about what they called the biladas-sudan, the territory of the Negro peoples south of the Sahara. (19/761)

اسلام جب اپنی صحیح صورت میں زندہ ہوتا ہے تو وہ صرف معروف مذہبی پہلوؤں کو زندہ نہیں کرتا بلکہ اسی کے ساتھ وہ انسانیت کے تمام ضروری پہلوؤں کو بھی زندہ کر دیتا ہے۔

ویسٹ انڈیز اور امریکہ کی دریافت کے بعد وہاں زراعت کا کام بڑھا۔ وہاں زمینیں تھیں مگر انسان نہ تھے۔ اس لئے زرعی مزدور کے طور پر غلاموں کی تجارت میں زبردست اضافہ ہوا۔ ۱۷۸۰ اور اس کے بعد کے سالوں میں تقریباً ۰۰۰ ، ۷ غلام ہر سال افریقہ سے لے جاکر ویسٹ انڈیز اور امریکہ کے ساحل پر اتارے جارہے تھے (19/768)

غلاموں کی اس تجارت کو جس چیز نے ختم کیا وہ مشین کی ایجاد ہے۔ بعد کو جب زرعی مشینیں تیار ہو گئیں تو انسانی مزدوروں کی ضرورت اپنے آپ ختم ہو گئی۔ بعض اوقات کسی برائی کو ختم کرنے کے لئے صرف اخلاقی تبلیغ کافی نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ ضرورت ہوتی ہے کہ مروجہ برائی کی اقتصادی یا سیاسی اہمیت کو ختم کر دیا جائے۔ اس کے بعد وہ برائی اسی طرح ختم ہو جائے گی جس طرح کسی زندہ چیز سے

پانی نکال لیا جائے اور وہ اپنے آپ ہلاک ہو جائے۔

سینیگال کی ایک عجیب جغرافی صفت ہے جو دنیا کے کسی دوسرے ملک میں نہیں پائی جاتی۔ وہ یہ کہ ایک اور ملک اٹلانٹک کے ساحل سے ایک لمبے انکلیو (enclave) کی صورت میں سینیگال کے اندر گھسا ہوا ہے۔ یہ دوسرا ملک گامبیا ہے جو انگلی کی مانند تقریباً ۲۰ میل چوڑا اور ۲۰۰ میل لمبا اٹلانٹک کے ساحل سے سینیگال کے اندر تک چلا گیا ہے:

The Gambia constitutes a finger of territory 20 miles wide and 200 miles long that thrusts from the cost eastward deep into Senegal (16/531).

سینیگال ایک خوش حال ملک ہے اور گامبیا ایک غریب ملک۔ سینیگال میں غلہ کے علاوہ فاسفیٹ، لوہا، پٹرول وغیرہ پیدا ہوتا ہے۔ جب کہ گامبیا کی حالت تقریباً وہی ہے جو برصغیر میں بنگلہ دیش کی۔



یہ نو آبادیاتی طاقتوں کی دین ہے۔ پچھلی صدی میں ایسا ہوا کہ فرانسیسی سینیگال میں داخل ہوئے اور انگریز گامبیا میں۔ دونوں میں ایک دوسرے پر غلبہ پانے کے لئے کئی لڑائیاں ہوئیں۔ آخر یہ سمجھوتہ ہوا کہ انگریز گامبیا کے کچھ علاقے فرانسیسیوں کو دیدیں۔ اور اس کے بدلے فرانسیسی صومالیہ کے کچھ علاقے انگریزوں کے حوالے کردیں۔ اس طرح گامبیا کا موجودہ عجیب وغریب ملک بنا۔

افریقہ کے لئے روانگی سے پہلے میں نے ہندستان کے ایک اسلامی پرچہ (۱۰ اپریل ۱۹۹۰) میں ایک مضمون پڑھا۔ اس کا عنوان تھا "افریقہ میں اسلام" اس مضمون میں بتایا گیا تھا کہ افریقہ کے لوگوں نے نہایت آسانی کے ساتھ اسلام قبول کرلیا اور وہاں مسلمانوں نے بڑی بڑی سلطنتیں قائم کیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ :

"عیسائیت کے مقابلہ میں اسلام کی تعلیمات بہت سادہ تھیں۔ اسلام نے مقامی افراد کی تہذیبی اقدار کو کم سے کم چھیڑا۔ اسلام نے وہ تمام باتیں قائم رہنے دیں جو اسلامی تعلیمات کے خلاف نہیں تھیں۔ اور افریقیوں کو ان کے اپنے طور طریقوں کے ساتھ رہنے دیا"

یہ بات بذات خود صحیح ہے۔ اور میں نے اپنے سفر افریقہ میں اس کی مختلف مثالیں دیکھیں۔ مگر ہندستانی مسلمانوں کا یہ مزاج بہت عجیب ہے۔ افریقہ اور دوسرے ملکوں کے بارہ میں اسلام کا یہ تقاضا ان کی سمجھ میں آجاتا ہے کہ زندگی کے طور طریقے جو براہ راست اسلام سے نہیں ٹکراتے، ان میں غیر ضروری طور پر اپنی شناخت قائم کرنے کی کوشش کرنا دانش مندی نہیں ہے۔ مگر ہندستان میں آتے ہی ان کا مزاج بالکل بدل جاتا ہے۔ یہاں ان کو اسلام کا مسئلہ نمبر ایک یہ نظر آنے لگتا ہے کہ مسلمان ہر معاملہ میں اپنی قومی شناخت علیحدہ قائم کریں۔ خواہ اس کا نتیجہ یہی کیوں نہ ہو کہ ہندستان میں اسلام کی اشاعت کا کام بند ہو کر رہ جائے۔

افریقہ کی بیشتر آبادی مسلمان ہے۔ اس اعتبار سے افریقہ ایک مسلم براعظم ہے۔ اگرچہ ایشیا وہ براعظم ہے جہاں سب سے زیادہ تعداد میں مسلمان آباد ہیں۔ مگر ایشیا میں مجموعی آبادی کے اعتبار سے دیکھا جائے تو یہاں نسبتاً زیادہ تعداد غیر مسلم اقوام کی ہے۔ جب کہ افریقہ میں اسلام سب سے بڑے مذہب کی حیثیت رکھتا ہے۔ تاہم چند ملکوں کو چھوڑ کر بقیہ ممالک میں مسلمان کافی پس ماندہ ہیں۔ حتی کہ بعض ملکوں میں مسلم اکثریت کے باوجود عیسائی فرقہ حکومت کر رہا ہے۔ اس کی وجہ "عیسائی سازش" نہیں بلکہ مسلمانوں کی پس ماندگی ہے۔ مسلمان ان ملکوں میں تعلیمی اعتبار سے اتنے پیچھے ہیں

کہ مقابلتہً وہ وہاں حکمراں بننے کی پوزیشن میں نہیں۔

حکومتوں کی دعوت پر یا انٹرنیشنل کانفرنسوں میں شرکت کے لئے جو سفر ہوتے ہیں، ان میں آدمی کو مصنوعی ماحول میں رہنا ہوتا ہے۔ مثلاً کاروں کے قافلہ میں خصوصی راستوں پر سفر کرایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس قسم کا سفر کرنے والے کسی ملک کی حقیقی تصویر کو بہت کم دیکھ پاتے ہیں۔

میں اکثر ان اہتمامات کو توڑ کر ملکی حالات کو جاننے کی کوشش کرتا ہوں۔ مثلاً ایک بار میں نے اپنی کار چھوڑ دی اور ایک عام بس پر بیٹھ گیا جو مطلوبہ منزل کی طرف جا رہی تھی۔ اس سفر کے دوران کئی نئی باتوں کا تجربہ ہوا۔ مثلاً میں نے دیکھا کہ عام افریقی بہت زیادہ بولتے ہیں، اور زیادہ بولنا ہمیشہ کم سوچنے کی قیمت پر ہوتا ہے۔ ایک جگہ میں نے دیکھا کہ کئی خنزیر گھوم رہے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوا کہ یہاں مذہبی رواداری بہت زیادہ پائی جاتی ہے۔ اسی طرح اندازہ ہوا کہ اندرونی سڑکیں اتنی اچھی نہیں ہیں جتنی بیرونی سڑکیں اچھی ہیں۔ عام افریقیوں کے مکان بہت معمولی نظر آئے۔ وغیرہ

اسلام افریقہ میں داخل ہوا تو پہلے وہ اس کے شمالی حصہ میں پہنچا۔ کیوں کہ یہ حصہ عرب دنیا سے ملا ہوا تھا۔ مغربی افریقہ میں اسلام کسی قدر بعد میں پہنچا۔ کہا جاتا ہے کہ مغربی افریقہ کے مسلمانوں ہی نے سب سے پہلے امریکہ کو دریافت کیا۔ وہ برازیل تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئے۔ برازیل (جنوبی امریکہ) کا نام ایک افریقی قبیلہ کے نام پر ہے جس کا واحد برزلہ اور جمع برازل ہے۔ وغیرہ

ایک مورخ نے مغربی غلبہ کے زمانہ میں لکھا تھا کہ افریقہ میں کئی بڑے بڑے علاقے ہیں جہاں کبھی اسلامی حکومت قائم نہیں ہوئی۔ اس کے باوجود اسلام وہاں پہنچا۔ حتی کہ اب بھی وہاں اسلام پھیل رہا ہے جب کہ وہاں کے یورپی حکمراں اس کی راہ میں رکاوٹیں ڈالنے میں مشغول ہیں :

> There are vast regions in the continent that never knew Islamic domination, and yet Islam is spreading there even in these dxays inspite of the vigilance kept and obstacles set up by their Occidental masters (p. 213).

حقیقت یہ ہے کہ اسلام فطرت کا دین ہے۔ وہ جہاں بھی پھیلتا ہے، فطرت کے زور پر پھیلتا ہے نہ کہ حکومت یا مادی طاقت کے زور پر۔

ہوٹل کے کمرہ کی میز پر ہوٹل کی طرف سے مختلف قسم کے اشتہاری کارڈ رکھے ہوئے تھے۔ ایک کارڈ پر لکھا ہوا تھا کہ نئے دن کے آغاز کے لئے اس سے بہتر طریقہ کیا ہے کہ آپ ہمارے بوفے ناشتہ سے اس کا آغاز کریں :

What better way to start a new day than our breakfast buffet?

اس کو پڑھتے ہوئے مجھے وہ حدیث یاد آگئی جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس شخص نے صبح کی نماز پڑھ لی وہ اللہ کی ذمہ داری میں آگیا (من صلی الصبح فھو فی ذمۃ اللہ) گویا ہوٹل کے مالک کی سوچ یہ ہے کہ آدمی اس کے تجارتی ناشتہ سے اپنی صبح کا آغاز کرے۔ اس کے برعکس پیغمبر کی سوچ یہ ہے کہ آدمی یاد خداوندی سے اپنی صبح شروع کرے۔

ہوٹل کا مالک صلاۃ صبح سے اختلاف نہیں کرے گا۔ اسی طرح پیغمبر صبح کے ناشتہ سے کسی کو نہیں روکے گا۔ مگر ہوٹل والے کے ذہنی سانچہ میں یاد خداوندی ثانوی چیز ہے اور پیغمبر کی فکر میں ناشتہ ثانوی چیز۔ اسی تقدیم وتاخیر کے نتیجہ میں ایک رویہ دنیا پرستی بن جاتا ہے اور دوسرا رویہ آخرت پسندی۔

۷ مئی کو صبح ۱۰ بجے کا وقت ہے۔ میں ہوٹل کے باہر کے حصہ میں ایک کرسی پر بیٹھا ہوا ہوں۔ ایک طرف ہوٹل کی بلند و بالا عمارت ہے۔ دوسری طرف سمندر حد نظر تک پھیلا ہوا موجیں مار رہا ہے۔ درمیان میں سبزہ اور پھول اور درخت کے مناظر ہیں۔ موسم نہایت خوشگوار ہے۔ ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے لمس ربانی کی مانند ہر چیز کو چھوتے ہیں اور پھر گزر جاتے ہیں۔ چڑیوں کی آوازیں قدرتی نغمہ بکھیر رہی ہیں۔

"دنیا جب اتنی حسین ہے تو آخرت کتنی زیادہ حسین ہوگی" میری زبان سے نکلا۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دنیا آخرت کی دنیا کا ایک ابتدائی تعارف ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں اس کے ساتھ "حزن" رکھ دیا تاکہ کوئی شخص یہاں اپنا دل نہ لگا سکے۔ آدمی سے یہ مطلوب ہے کہ وہ موجودہ دنیا کے آئینہ میں آخرت کو دیکھے۔ لیکن اگر آدمی موجودہ دنیا ہی کو اصل سمجھ کر اس میں کھو جائے تو یہ ایسا ہی ہوگا جیسے آپ آئینہ میں ایک خوبصورت پھول دیکھیں اور اس پھول کو خود آئینہ کے اندر حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگیں۔

(باقی)

۱ کنیز مراد صاحبہ ایک ۵۰ سالہ خاتون ہیں۔ وہ ترکی کے سلطان مراد کے خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس وقت وہ فرانس کے شہر پیرس میں رہتی ہیں۔ وہ فرانسیسی زبان کی مصنفہ ہیں۔ ۷ مئی کو وہ اسلامی مرکز میں آئیں۔ صدر اسلامی مرکز سے انھوں نے اسلام کے بارہ میں مختلف سوالات پر مفصل تبادلہ خیال کیا۔ آخر میں انھیں انگریزی الرسالہ کے کچھ شمارے اور پیغمبر انقلاب (انگریزی) مطالعہ کے لئے دی گئی۔

۲ گجرات کی ممتاز عربی درس گاہ دار العلوم بھروچ سے ایک گجراتی ماہنامہ نکلتا ہے جس کا نام دار العلوم ہے۔ یہ ایک کثیر الاشاعت اور معیاری ماہنامہ ہے۔ اس نے الرسالہ کا مضمون (صاحب قرآن) گجراتی زبان میں شائع کیا ہے۔ اسی طرح اور بھی گجراتی رسائل الرسالہ کے مضامین کبھی حوالہ کے ساتھ اور کبھی بغیر حوالہ شائع کرتے رہتے ہیں۔

۳ مانو ایکتا ابھیان (نئی دہلی) کی طرف سے لال قلعہ کے میدان میں "عید ملن" کی تقریب ہوئی۔ اس میں لوک سبھا کے اسپیکر مسٹر ربی رے، جسٹس تارکنڈے اور دوسری بہت سی ممتاز شخصیتیں شریک ہوئیں۔ منتظمین کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس موقع پر شرکت کی اور وہاں اپنے خیالات پیش کئے۔

۴ جنیوا (سوئٹزرلینڈ) میں ۳ مئی ۱۹۹۰ کو ایک کانفرنس تھی۔ صدر اسلامی مرکز کے نام اس کا دعوت نامہ آیا تھا اور ٹکٹ بھی آچکا تھا۔ مگر بعض اسباب سے وہ اس میں شرکت نہ کر سکے۔ مغربی ملکوں میں بڑے پیمانہ پر اسلامی دعوت کے امکانات کھل گئے ہیں۔ جن کو استعمال کرنے کی ضرورت ہے۔

۵ کچھ نئی کتابیں تیار ہو چکی ہیں۔ ان میں سے ایک "راہ عمل" ہے۔ اس کتاب میں تفصیل کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ عصر حاضر میں دعوت کا اسلوب کیا ہونا چاہئے۔

۶ ایک صاحب لکھتے ہیں: اس وقت رات کے ایک بج کر ۳۰ منٹ ہو رہے ہیں۔ ہاتھوں میں مارچ ۱۹۹۰ کا اردو الرسالہ لئے پڑھ رہا تھا کہ آپ کے سفرنامہ کی روداد میں جب پاکستان کے ان بزرگ کا یہ جملہ "میاں بیٹھنے کا وقت کہاں، اب تو لیٹنے کا وقت ہے"

پڑھا، اور اس کو سن کر آپ نے جو اپنی کیفیت بیان کی تو یقین جانئے اسی وقت میں بھی تڑپ اٹھا۔ دوسرے ہی لمحہ میں نے یہ انتر دیشی نکال کر ایجنسی کے لئے آپ کو لکھنے کا تہیہ کرلیا۔ بے شک الرسالہ کا ایک ایک حرف انقلاب پیدا کر دیتا ہے دل ودماغ میں۔ میرے نام الرسالہ کے دس پرچوں کی ایجنسی جاری کر دیں۔ (سید مقصود العام والا انجنیئر، اورنگ آباد)

۷ ایک صاحب لکھتے ہیں: الحمد للہ اس زمانہ میں آپ کی قیادت میں الرسالہ کے ذریعہ اللہ لاکھوں انسانوں کو ہدایت سے نواز رہا ہے۔ میرے لئے تو الرسالہ اندھیرے میں جگنو کی طرح ہے۔ میں تو گویا اس کا عاشق ہوں۔ ایک مہینہ کا پرچہ لینے کے بعد دوسرا پرچہ کب ملے گا، اسی انتظار میں رہتا ہوں (شیخ بابو میاں، اورنگ آباد)

۸ الرسالہ کے عربی اڈیشن کے بدل کے طور پر کچھ عرب نوجوان ایسا کر رہے ہیں کہ وہ الرسالہ کے بعض مضامین کا عربی میں ترجمہ کرواتے ہیں۔ اور ان کی فوٹو کاپی کر کے ان کو عربوں کے درمیان پھیلاتے ہیں۔

۹ خدا کا فضل ہے کہ ماہنامہ الرسالہ اردو پاکستان (کراچی) سے چھپنا شروع ہو گیا ہے۔ یہ کسی اضافہ یا کمی کے بغیر ہندستانی اڈیشن کی نقل ہوتا ہے۔ اس سلسلہ کا پہلا شمارہ مارچ ۱۹۹۰ میں شائع ہوا ہے۔ پاکستان کے قارئین الرسالہ کی عرصہ سے خواہش تھی کہ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی افکار کو پاکستان میں زیادہ سے زیادہ پھیلانے کے لئے اس کو پاکستان سے شائع کیا جائے۔ اس کے مطابق اس کا اجرا عمل میں آیا ہے۔

۱۰ ایک صاحب لکھتے ہیں: میں الرسالہ کا مطالعہ تین سال سے کر رہا ہوں۔ اس کی تحریریں دلوں کو چھونے والی ہیں۔ اس کو پڑھنے کے بعد دل نے کہا کہ واقعی صحیح راہ یہی ہے۔ ہم لوگوں نے مل کر ایک ایجنسی بھی لے لی ہے جو کہ تمام طلبہ میں تقسیم ہوتی ہے۔ ہماری کوشش یہ ہوتی ہے کہ الرسالہ کے مضامین زیراکس کرا کر لوگوں میں تقسیم کر دیں۔ (اقبال الرحمٰن، علی گڑھ)

۱۱ ایک صاحب لکھتے ہیں: الرسالہ آدمی کو سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ ۱۹۸۲ سے میں نے اسے محفوظ کرنا شروع کر دیا ہے۔ ۸۲ء سے اب تک کا الرسالہ ہر سال کا میں نے الگ

الگ مجلد کروالیا ہے۔ سفر میں الرسالہ کی ایک جلد میرے شریک سفر رہتی ہے۔ الرسالہ کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ کچھ دنوں کے بعد کوئی سا بھی شمارہ پڑھئے، نیا ہی معلوم ہوتا ہے۔ اور پریشانی کے عالم میں آپ کی تحریر ایک نیا حوصلہ عطا کرتی ہے۔ جیسا کہ آپ لکھتے ہیں کہ الرسالہ کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ تو پھر میں نے بھی اس کو اسلام کی ضرورت سمجھ کر الرسالہ کی ایجنسی لے لی۔ پہلے پانچ کاپی منگواتا تھا۔ اب پندرہ کاپی منگواتا ہوں (مظفر امام، گیا)

۱۲ ملک کا سنجیدہ طبقہ نہایت دل چسپی کے ساتھ الرسالہ پڑھ رہا ہے اور اکثر خط یا ملاقات کے ذریعہ اپنے تاثرات کا اظہار کرتا رہتا ہے۔ مثلاً ۲۸ اپریل ۱۹۹۰ کو جناب کلدیپ سنگھ گجرال (نئی دہلی) مرکز میں آئے اور دیر تک صدر اسلامی مرکز سے ملاقات کی۔ انھوں نے کہا کہ میں نے بہت کتابیں اور میگزین پڑھی ہیں۔ مگر الرسالہ (اردو) نے مجھ کو جتنا متاثر کیا اتنا کسی نے بھی متاثر نہیں کیا۔

۱۳ مختلف اخبارات الرسالہ کے مضامین نقل کرتے رہتے ہیں۔ اس طرح الرسالہ کا پیغام وسیع تر حلقہ میں برابر پھیل رہا ہے۔ مثلاً بمبئی کے اخبار انقلاب (۷ اپریل ۱۹۹۰) نے اور اردو ٹائمز (۱۹ اپریل) نے الرسالہ کے کئی مضامین نمایاں طور پر نقل کئے ہیں۔

۱۴ محمود حسین زیدی صاحب علی گڑھ انجنیئرنگ کالج میں استاد ہیں۔ انھوں نے ۳ مئی ۱۹۹۰ کی ملاقات میں بتایا کہ وہ گاڈ ارائزز کئی بار خرید چکے ہیں مگر اب تک اس کو ختم نہ کر سکے۔ کیوں کہ جو شخص دیکھتا ہے اس کو قیمت دے کر لے لیتا ہے۔ باہر کے افراد مثلاً ناروے کے ایک پروفیسر علی گڑھ آئے تھے، وہ بھی اسی طرح ان سے کتاب لے گئے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جدید طبقہ میں مرکز کی کتابوں کی مانگ کتنی بڑھ چکی ہے۔

۱۵ الرسالہ مئی ۱۹۹۰ میں جناب سید شفیع الدین صاحب کی ایک انگریزی نظم بعنوان "ذہنی سفر" صفحہ ۴۲ پر چھپی تھی۔ اس میں غلطی سے موصوف کی تعلیمی ڈگری کے تحت M.A. (Eng), M.Ed. لکھ دیا گیا تھا جب کہ اصلاً وہ M.A., M.Com. ہیں۔

۱۶ الرسالہ کے ہندی اڈیشن کی تیاریاں جاری ہیں۔ ان شاء اللہ جلد ہی شائع ہوگا۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملّت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے۔ جو آج ملّت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوّت ہے اور ملّت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کر دیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدّت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زرتعاون الرسالہ

قیمت فی شمارہ	۵ روپیہ
زر تعاون سالانہ	۶۰ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۳۰۰ روپیہ
بیرونی ممالک کے لیے	
ہوائی ڈاک (سالانہ)	۲۵ ڈالر امریکی
بحری ڈاک (سالانہ)	۱۵ ڈالر امریکی
خصوصی تعاون سالانہ	۱۰۰ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلیشر مسئول نے نائس پرنٹنگ پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا



RNI 28822/76 □ September 1990 No. 166 □ Rs. 5

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

تذکیر القرآن جلد اوّل	Rs 150/-
" جلد دوم	150/-
اللہ اکبر	40/-
پیغمبر انقلاب	35/-
مذہب اور جدید چیلنج	40/-
عظمت قرآن	25/-
دین کامل	45/-
الاسلام	35/-
ظہور اسلام	35/-
اسلامی زندگی	25/-
احیاء اسلام	20/-
رازِ حیات (مجلد)	55/-
صراطِ مستقیم	35/-
خاتونِ اسلام	40/-
سوشلزم اور اسلام	35/-
اسلام اور عصرِ حاضر	25/-
حقیقت حج	30/-
اسلامی تعلیمات	25/-
اسلام دورِ جدید کا خالق	20/-
رشدیات	
تعبیر کی طرف	8/-
راہِ عمل	
تبلیغی تحریک	20/-
میوات کا سفر	30/-
اقوالِ حکمت	20/-
کی غلطی	45/-

دین کی سیاسی تعبیر	15/-
دین کیا ہے	4/-
قرآن کا مطلوب انسان	10/-
تجدید دین	[illegible]
اسلام دین فطرت	5/-
تعمیر ملت	5/-
تاریخ کا سبق	5/-
مذہب اور سائنس	
عقلیات اسلام	
فسادات کا مسئلہ	4/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	4/-
تعارف اسلام	4/-
اسلام پندرھویں صدی میں	4/-
راہیں بند نہیں	5/-
ایمانی طاقت	5/-
اتحاد ملت	5/-
سبق آموز واقعات	5/-
زلزلۂ قیامت	7/-
حقیقت کی تلاش	5/-
پیغمبر اسلام	4/-
آخری سفر	5/-
اسلامی دعوت	5/-
خدا اور انسان	5/-
حل یہاں ہے	8/-
سچا راستہ	4/-
دینی تعلیم	5/-

حیات طیبہ	5/-
باغ جنت	5/-
نار جہنم	5/-

الرسالہ کیسٹ

نمبر ۱ ایمان	25/-
نمبر ۲ جدید امکانات	25/-
نمبر ۳ اسلامی اخلاق	25/-
نمبر ۴ اتحاد	25/-
نمبر ۵ تعمیر ملت	25/-
نمبر ۶ سنت رسولؐ	25/-
نمبر ۷ میدان عمل	25/-
نمبر ۸ پیغمبرانہ رہنمائی	25/-
الرسالہ مجلد فی جلد	75/-

God Arises	Rs 60/-
Muhammad The Prophet of Revolution	65/-
Religion and Science	30/-
Tabligh Movement	20/-
The Way to Find God	5/-
The Teachings of Islam	6/-
The Good Life	6/-
The Garden of Paradise	6/-
The Fire of Hell	6/-
Muhammad The Ideal Character	5/-
Man Know Thyself!	5/-

U/SE112/86

مکتبہ الرسالہ سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳